

ک

مرتب
نیاز فخری

قواعد رسالہ نگار

- ۱۔ رسالہ ہر مہینے کی پندرہ تاریخ سے پہلے شائع ہوتا ہے
- ۲۔ رسالہ نہ پہنچنے کی صورت میں بیس تاریخ سے پہلے دفتر کو اطلاع ہونی چاہئے ورنہ رسالہ مفت روانہ کیا جائیگا
- ۳۔ خط و کتابت کے وقت اپنا نمبر خریداری ضرور لکھئے جس پر نمبر خریداری نہیں ہوتا ایسے خطوط صلح کر دیے جاتے ہیں
- ۴۔ جواب طلب امور کے لئے جوابی کارڈ یا اس کا ٹکٹ آنا ضروری ہے
- ۵۔ مضامین صاف اور خوشخط آنے چاہئیں۔
- ۶۔ سالانہ قیمت پانچ روپیہ، ششماہی تین روپیہ۔ بیرون ہند سات روپیہ سالانہ۔

نگار

تقدیر صفحہ	ایک صفحہ	نصف صفحہ	پاؤ صفحہ	نرخ تمامہ اجرت اشتہارات	تقدیر صفحہ	ایک صفحہ	نصف صفحہ	پاؤ صفحہ
یا ہر تہ	۱۰۰ روپیہ	۶۰ روپیہ	۴۰ روپیہ	(۱) اجرت ہر حال میں پیشگی آنا ضروری ہے (۲) جو صاحبان	تین مرتبہ	۳۵ روپیہ	۲۴ روپیہ	۱۴ روپیہ
چھ مرتبہ	۶۰ روپیہ	۳۵ روپیہ	۲۵ روپیہ	یقیناً ماہ سے زائد اشتہار دیں گے ان کو بیس فیصد کمیشن دیا جائیگا	ایک مرتبہ	۱۰ روپیہ	۹ روپیہ	۶ روپیہ
				(۳) سجاد اشتہار کے اندر دو مہینے قبل اطلاع دینے پر رضامند ہو سکتا ہے				

چوتھائی قیمت پیشگی آنی لازم ہے

نگار ایک سنہ لکھنؤ

جواب کیلئے ٹکٹ آنا ضروری

مرزا غالب	نبات نعش	مولانا شبلی	سفرنامہ مصر و شام	موازنہ انیس دہر سے	محامد خاتم النبیین
اردوئے معلیٰ	مرآة العروس	سیرۃ النبی جلد اول	علم الکلام	مضامین عالمگیر	ضیاء سخن
عود ہندی	توبۃ النصوح	دوم	کلام	آغاز اسلام	مکاتیب امیر مینائی
دیوان حبیبی	موعظہ حسنہ	سوم	رسائل شبلی	کلیات فارسی	رتن ناتھ سرشار
مکمل دیوان	روایۃ صادقہ	الفاروق	مقالات شبلی	کلام شبلی اردو	فسانہ آزاد
	ایامی	سیرۃ النعمان	شعر المعجم جلد اول	امیر مینائی	سیر کسار
	فسانہ مبتلا	الغزالی	دوم	امیر اللغات	خدائی فوجدار
مولانا نذیر احمد	ابن الوقت	الممامون	سوم	صنمخانہ عشق	جام سرشار
حامل مترجم	مصائب غدر	سوانح مولانا روم	چہارم	مرآۃ الغیب	افیلی بطرنا دل
الحقوق والفرایض			پنجم		

نگار

اڈیٹرز: نیاز فتح پوری

شمار ۱

فہرست مضامین جولائی ۱۹۲۷ء

جلد ۱۲

۸۹	محمود اسرائیلی ،	۲	منظومات و غزلیات	ملاحظات
	امین حنین	۵	غلام ربانی عزیز	غالب کا ذوق فارسی
	باسط بھوپالی	۱۲	عبدالباری آسی	طنزیات
	نقیب کانپوری	۱۸	شہاب برنی	خانے کاراز (فشا)
	دل شاہ بھانپوری	۳۲	میر ولی اللہ بی بی	ابن یسین
	جگر بریلوی	۴۷		علم فراست الید
	فرخ بنارسی	۵۵	مجنوں گورکھپوری	مراد (فشا)
	نظیر لودھیانوی	۶۸	سید عبدالسبحان ناظر	اکبر آئین اکبری میں
	مجنوں گورکھپوری	۷۳		تایخ کا ایک گمشدہ ورق (فشا)
۹۲	استفسارات	۷۷	سید عجاز حسین بی بی	حالی اور شاعری
۹۲-۹۴	مسلومات	۸۳	ملار موزی	نکاحات

نگار

اڈیٹر:- نیاز فتحپوری

شمار (۱)

جولائی ۱۹۲۷ء

جلد (۱۲)

ملاحظات

جین لوگوں کو گرمی اور بارش کا زمانہ بھوپال میں بسر کرنے کا موقع ملا ہے وہ واقف ہیں کہ یہ دونوں موسم وہاں کے کستور
 پلکے اور پر لطف ہوتے ہیں۔ اس لئے اب جو میں بارہ سال تک ان دونوں کا لطف اٹھانے کے بعد یہاں آیا ہوں، تو ایسا
 محسوس کرتا ہوں کہ گرمی شاید خدا کا کوئی عذاب ہے جو ہر سال بندوں پر نازل ہوتا ہے اور جس سے نجات پانے کی کوئی
 تدبیر انسان کے پاس نہیں ہے باوجودیکہ تمام وہ ذرائع جو تمدن کی اس عمدہ ترقی میں تمازت آفتاب اور برہمی موسم سے بچنے
 کے لئے مہیا ہو سکتے ہیں مجھے حاصل ہیں، لیکن اس کا کیا علاج کہ گرمی خود اپنے اندر سے ابلتی ہوئی نظر آتی ہے اور حد درجہ
 ناکام دل کی نفس سرد بھی آہ زباں سوز ہو کر نکلتی ہے پھر جس وقت یہ خیال کرتا ہوں کہ موت و حیات کے درمیان یہ کشمکش یہاں
 تقریباً اکتوبر تک اسی طرح رہیگی تو دل بیٹھنے لگتا ہے کہ بے اختیار دل چاہتا ہے کہ بہار آنے سے پہلے ہی دامن و گریباں
 کے فاصلہ کو کم کر دیا جائے حقیقت یہ ہے کہ جس ملک میں سال کا نصف حصہ اس طرح بسر ہو جہاں سال میں چار مرتبہ
 ”مداخل فصلیں“ آدمی کو مہینوں صاحب فراش رکھے، وہ ملک کیا خاک ترقی کر سکتا ہے اور وہاں کے بد نصیب افراد
 کیا دماغی و ذہنی تنیاز حاصل کر سکتے ہیں۔ آخری کابی لکھی جا رہی تھی اور میں گرمی کے خلاف ستیا گرہ کے ہوئے سیکار پڑا ہوا تھا

کہ مولوی نور الرحمن بی سہ (بچپرائی) کو جو حسن اتفاق سے آج کل میرے ہمان ہیں، مجھے رحم آیا اور انھوں نے معلومات کا حصہ مرتب کر دیا۔ جب سے نگار جاری ہو رہے، غالباً یہ پہلا موقع ہے کہ ماحول سے متاثر ہو کر نگار کی ترتیب کی طرف میں نے اپنے آپ کو مشوش پایا ہو یہی سبب ہے کہ میں اس مینے باب استفسار کی طرف بہت کم توجہ کر سکا۔

مقالہ آرگس کے جواب میں ابن یمن اور حافظ کی نزاع پر جناب میر دلی اللہ صاحب بی سہ کے مضمون حسب وعدہ اس مینے میں شائع ہو رہا ہے۔ گو آرگس کے استدلال پر اس سے زیادہ بحث و تحقیق کی ضرورت نہ تھی لیکن اگر میر دلی اللہ صاحب سعی فرماتے تو اس سے زیادہ تکمیل اس مضمون میں پیدا کر سکتے تھے۔ بہر حال اس مضمون کے بعد جناب آرگس کا فرض ہو جاتا ہے کہ وہ اس کا جواب دین، یا اپنی غلطی کا اعتراف کریں۔

جناب آسی کا مضمون طنزیات جاری ہے اور غالباً آئندہ ماہ کے رسالہ میں ختم ہو جائے گا خالص بھتیوں پر ایک مضمون خواجہ عبدالرؤف صاحب عشرت لکھنوی نے بھی ازراہ کرم عنایت فرمایا ہے جسے آپ اگلے مینے کے رسالہ میں ملاحظہ فرمائیں گے۔

اس وقت تک رسالہ "فسانہ" کا اجراء التوا میں ہے، لیکن جیسا کہ وعدہ کیا گیا تھا درجہ کے فسانے نگار میں شائع کئے جا رہے ہیں۔ خانے کا راز۔ کینل ڈائل کے فسانہ کا ترجمہ ہے اور مراد حضرت مخنوں گورکھپوری کا طبع زاد فسانہ ہے جس میں انھوں نے اپنی انداز تحریر کی خصوصیات کو پوری طرح قائم رکھا ہے اور شخصیت نگاری کی ایک اچھی مثال پیش کی ہے۔

تیسرا فسانہ عبدالرحمن الدخیل کے متعلق ہے جو باوجود تاریخی واقعات ہونے کے صفحات تاریخ سے معدوم ہے اس لحاظ سے یہ فسانہ بہت زیادہ اہمیت رکھتا ہے، گزشتہ ماہ کے رسالے میں نیولین کی بیوی جو ز فاین کے متعلق بھی ایک ایسا ہی سچا واقعہ درج کیا گیا تھا جو تاریخ کی کتابوں میں نظر نہیں آتا۔

حالی کی شاعری کے متعلق سید اعجاز حسین صاحب بی سہ کا مضمون آئندہ مینے میں ختم ہو گا۔ ہر چند سید صاحب نے کافی محنت کے ساتھ یہ مضمون مرتب کیا ہے۔ لیکن یہ موضوع اس سے زیادہ وسعت کا محتاج ہے اور خالص شاعرانہ

اعلیٰ درجہ کا عطر صفر علی محمد علی تاجر عطر لکھنؤ سے منگا کر استعمال کرنا چاہئے

نقطہ نظر سے بھی نہایت غائر نقد و تبصرہ چاہتا ہے، کیونکہ حالی کے متعلق ان حلقوں میں جہاں شاعری نام صرف ایک مخصوص رنگ تغزل کا ہے، یہ سورتون پایا جاتا ہے کہ حالی ناظم ضرورت کے لیکن شاعری سے انہیں کوئی لگاؤ نہ تھا۔ حالانکہ اس سے زیادہ تنقیدی معصیت اور کوئی نہیں ہو سکتی کہ یہ الزام رکھ کر حالی کو شاعروں کے گردہ سے جدا کیا جائے۔ کیونکہ اس مخصوص رنگ تغزل کے لحاظ سے بھی حالی کا مرتبہ بہت بلند ہے اور ان کی قدیم رنگ کی شاعری میں وہی تمام خصوصیات پائی جاتی ہیں جن پر دہلی کے شعراء متقدمین میں کوئی بہتر سے بہتر شاعر ناز کر سکتا تھا۔ افسوس ہے کہ سید اعجاز حسین صاحب نے اس پہلو کی طرف توجہ نہیں کی اور حالی کی صرف اس شاعری کو پیش نظر رکھا جس میں انہیں انفرادیت کی حیثیت حاصل تھی۔

عصہ سے میری خواہش ہے کہ کلام مومن پر ایک فاضلانہ تنقید کی جائے اور میں نے اپنے بعض احباب کو اس طرف متوجہ بھی کیا۔ لیکن کوئی نتیجہ نہ نکلا، جس کی وجہ شاید یہ ہو کہ کلام مومن ان کا درخور ذوق نہ تھا یا یہ کہ میری التجالاتی التفات نہ تھی بہر حال اب میں پھر ارباب علم و ادب کو اس طرف متوجہ کرنا چاہتا ہوں اور اس خیال سے کہ شاید اس روحانی خدمت کے لئے کوئی مادی ترغیب کارگر ہو سکے۔ یہ اعلان بھی کرتا ہوں کہ جن صاحب کا مضمون سب سے بہتر ہوگا ان کی خدمتیں ضہر کا محقر ہدیہ پیش کیا جائے گا۔

آئندہ مہینے کے رسالہ میں ”فتا کا حصہ زیادہ وسیع ہوگا اور منجملہ دیگر افسانوں کے ایک فسانہ جو اربکاب جرم اور انکشاف جرم دو حصوں میں منقسم ہے اور جو اپنی ترتیب اور نوعیت کے لحاظ سے بالکل نئی چیز ہے خصوصیت کے ساتھ نہایت دلچسپ ہوگا۔ علاوہ افسانوں کے اور مضامین بھی بعض معرکہ الآراء مباحث پر پیش کئے جائیں گے۔

عام طور پر رسائل مضمون کی کمی کے شاکر رہتے ہیں، مجھے یہ شکایت ہے کہ رسالہ کے سو صفحات بھی کافی نہیں ہوتے۔ چنانچہ آپ ملاحظہ فرمائیں گے کہ گزشتہ دو ماہ سے رسالہ کی کتابت بہت گنجان کرادی گئی ہے لیکن اس پر بھی ایک مسلسل مضمون لارڈ رین کا عہد حکومت نہیں دیا جاسکا، حالانکہ اس کو اپنی اہمیت کے لحاظ سے برابر جاری رہنا چاہئے تھا آئندہ کے لئے میں نے ارادہ کیا ہے کہ اگر رسالہ کے موجودہ صفحات نا کافی ہوئے تو میں اس مضمون کے لئے اور چند صفحات کا اضافہ کر دوں گا

نیاز فوری

غالب کا ذوق فارسی

(گزشتہ سے پیوستہ)

مرزا چونکہ فطرتاً شاعر تھے اس لئے ان کے یہاں آمد و روانی اور سلاست کا یہ عالم ہے کہ ایک سمندر رہے جو نہایت سکون اور اطمینان سے صرف روانی ہے۔ واقعہ نگاری میں جہاں نہایت سلاست اور بے ساختہ پن کی ضرورت ہوتی ہے ان کا کلام نہایت سلیس اور روان ہوتا ہے۔ مگر جہاں وہ موقع پاتے ہیں اپنے خاص طرز انداز میں بھی کچھ نہ کچھ کتے چلے جاتے ہیں گو بعض اوقات ان کا یہ طرز بیان نچرل اور فطری نہیں رہتا۔ اور انھیں اس کا علم بھی ہوتا ہے مگر وہ اپنے طرز بیان کو بدلنے پر راضی نہیں ہوتے اور انشا پر دازی کا یہ جذبہ اپنا کام کرتا رہتا ہے۔

واقعات نگاری میں مختلف افراد کے کیر کڑ میں مرزا یکسانیت قائم نہیں رکھ سکتے۔ وہ ایک ادنیٰ آدمی کی زبان سے بعض اوقات ایسی باتیں کہ جاتے ہیں جو مناسب حال نہیں ہوتیں۔ اور یہی نایکسانیت ہے جو مرزا کے یہاں بہت پائی جاتی ہے اسی طرح بعض امور کے متعلق وہ جوش انشا پر دازی میں ضرورت سے زیادہ کہہ جاتے ہیں۔ لیکن چونکہ مرزا تمام ان امور کو ناقابل التفات اور ثانوی چیزیں خیال کرتے ہیں۔ اس لئے وہ ایسا کرتے ہیں۔

ثنوی درد و داغ میں ایک مفلس کے افلاس اور تنگدستی کا نقشہ یوں کھینچتے ہیں:-

دست تھی آئینہ قسمتش	زخم دل و داغ جگر دلتش
خانہ اش از دشت خطرناک تر	پیر منش از جگرش چاک تر
مایہ او داغ و ہماں در ہر ش	حاصل او خاک و ہماں بر سرش
ہر سحرش تیرہ تر از تیرہ شام	فاقہ پئے فاقہ کشیدے مدام

اب خیال فرمائے اتنے معمولی اور غیر اہم واقعے پر کس قدر زور انشا پر دازی صرف کیا گیا ہے چونکہ ان کا مقصد صرف نور

نگارش کی نمایش کرنا ہے۔ اس لئے وہ باقی امور کی طرف توجہ ہی نہیں فرماتے۔

پیرہن دریدہ کو جگر چاک سے تشبیہ کمال شاعری ہے جس سے ان کی غربت اور افلاس کا مکمل نقشہ آنکھوں کے سامنے پھر جاتا ہے۔ داغ دل کا حاصل خزانہ ناکامی ہی ہے مگر اسے خاک کہہ کر خاک بر سر کی جانب اشتعال کتنا پیا ر اطرز ادا ہے۔ غم و اندوہ کا دن بلا شبہ ہزاروں مصائب اور تکالیف کا پیش خیمہ ہوتا ہے۔ مگر اسے شام اور پھر تیرہ شام، کہنا بہت ہی کیف افزا ہے۔ پھر تیرہ کی تکرار نے اور بھی غضب ڈھا دیا ہے۔

ہر قسم کا بہترین عطر صغریٰ علی محمد علی تاجر عطر لکھنؤ سے منگائیے

مغرب میں ان لوگوں کو جس دشوار گزار اور مصائب بار وادگی گزرنا پڑتا ہے اس کی وحشت اور مہبت کا نقشہ ملاحظہ فرمائے

دادی در دے کہ ہزارش بلا خاک بلاخیز و غبارش بلا
لالہ خود روش ز خون شہید ذرہ اشش از جوہر تیغ یزید
کشت در اں دادی آشو بناک جامہ عیانی شاں چاک چاک

اس وادی کے خود رو دلائے ان بیگناہ مقتولوں کے خون سے سیراب ہوئے ہیں جو اس وادی میں لقمہ نہنگ اجل ہوئے چنانچہ یہاں ان مصیبت زدوں کی مصائب بھی اتہار کو پہنچ گئیں اور ان کے پاس جو کچھ تھا وہ صرصر فنا کی نذر ہو گیا۔ ادبی زاویہ نگاہ سے یہ دونوں اشعار کس قدر دلاویز واقع ہوئے ہیں۔ کثرتِ تعب اور صبر آزما مسافت سے ان کے پاؤں میں چھلے پڑ گئے اور پیاس سے ان کی زبانیں خشک ہو گئیں اور ان کے اضطراب اور پریشانی کی کوئی حد نہ رہی درد و کلفت کی اس روح فرسا گھڑی میں انھیں ایک صحرائِ نشین زاہد کا تکیہ نظر پڑا۔

آبلہ ساغر شد و ساغر نشد زہر شد آب لب شاں تر نشد
از تپش دل بہ تمنائے آب ظرف نہ بستند بجز اضطراب
بود یہ بینوایہ دیر اینے تکیہ درویش بیا بانیے

آبلے کا بڑھ کر ساغر بن جانا اور ساغر نہ بننا کتنا بہترین اور دلغریب خیال ہے اور درویش صحرائِ نشین کو درویش بیا بانیے لکھنا کیسی اچھوتی ترکیب ہے

درویش صحرائِ نشین سے ان کا طرز خطاب ملاحظہ ہو۔

کائے چمن آرائے گلستان فیض خضر قدمگاہ، بیابان فیض

اس قدر مفلس اور قلاشوں کی زبان سے اتنا جست طرز خطاب کتنا مستبعد معلوم ہوتا ہے اور یہی وہ چیز ہے جس کو مرزا اپنے زور بیان کی رو میں بھول جاتے ہیں۔ یہ توقع کی جاسکتی ہے کہ اس قدر سخت نازک حالت میں ان کی زبان سے خوشامد و مدارات کے ایسے کلمے نکلیں۔ مگر یہ توقع نہیں ہو سکتی کہ اس قدر حیرت ہوں۔ اور پھر اس موقع پر صرف ایک شعر پر اکتفا کرتا غیر فطری ہے۔ گو یہ درست ہے کہ وہ جان پلپ تھے۔ مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ ایسے لائقِ شوق صحرائیں پانی کی درخواست کرنے کیلئے کس قدر موثر اور تر پادینے والی درخواست کارگر ہو سکتی ہے اور پھر مخاطب کی توجہ کو اپنی خستہ حالی کی طرف مبذول کرانے کے لئے کس قدر خوشا درکار ہے۔

خضر قدمگاہ۔ اور بیابان فیض بالکل انوکھی ترکیب ہیں۔

جب انھوں نے درویش سے اپنی تہہ حالی کا حال بیان کیا تو:-

پیر بجو شید ز گفتار شان گریہ اش آمد بر کار شان

ایسی دل ہلا دینے والی حالت میں گریہ، تو یقیناً موزوں ہے۔ مگر جوش کسی قدر غیر موزوں ہے حالانکہ یہ جوش کا کوئی مقام نہیں بلکہ مصرع یوں ہوتا چاہئے تھا۔ پیر بلرزید ز گفتار شان۔

گویہ ظاہر ہے کہ لرزنے کے لئے بھی جوش کی ضرورت ہے۔ مگر لفظ بلرزید سے جوش کا سمجھنا ایک ثانوی حقیقت ہے اور پہلے پہل اس سے صرف یہی سمجھا جاتا ہے کہ وہ ان کے حالات شکر اس قدر متاثر ہوا کہ رحم اور شفقت کے جوش سے وہ کانپنے لگا۔ اور ”جوشید“ سے بھی گودہن ادھر منتقل ہوتا ہے۔ مگر رحم اور شفقت کا تصور، معنی جوش کو سمجھ چکنے کے بعد دماغ میں آتا ہے۔ حالانکہ مقام کا اقتضا یہ ہے کہ رحم و شفقت کے تصور کے دماغ میں آچکنے کے بعد جوش کا تصور آئے۔ اور افسوس ہے کہ جوشید کے نقل سے یہ نہیں سمجھا جاتا۔

جب زاہد کی دعا سے بارگاہ خداوندی سے انہیں یہ رعایت عطا ہو گئی کہ ان میں سے ہر ایک کی ایک دعا مقبول ہوگی۔ تو صلاح یہ ٹھہری کہ سب سے اول عورت اپنے لئے دعا مانگے۔ چنانچہ مرزا اسے یوں بیان فرماتے ہیں۔

ماند بر آں پیر زن دل جواں قرعہ دیبا جگی امتحان

اب چونکہ اس عورت نے اپنے لئے دعا مانگی ہے کہ اسے پھر جواں بنا دیا جائے۔ اور اس کی یہی یہ دعا ان کی تباہی اور خستہ حالی کا پیش خیمہ ثابت ہوتی ہے اس لئے مرزا نے ان واقعات سے قارئین کے دماغ کو قبل از وقت روشناس کرانے کے لئے ”دل جواں“ اور ”امتحان“ کے الفاظ استعمال فرمائے ہیں۔ زرا غور و فکر کے بعد سمجھا جاسکتا ہے کہ دل جواں اور امتحان کے الفاظ کن آئندہ واقعات کی خبر دے رہے ہیں۔ اور پھر کم بخت پیر زن نے ہن ناقتات العقل والدین کا کیسا روشن ثبوت بہم پہنچایا۔ کہ بنا بنایا کھیل بگڑ گیا۔ دیبا جگی کا لفظ کتنا باموقع استعمال ہوا ہے۔

جب وہ عورت دعا سے پھر از سر نو جواں ہو گئی تو اس تبدیل حالت سے جو جذبات اس کے اور اس کے خاوند میں موجزن ہوئے مرزا انہیں یوں ادا کرتے ہیں۔

حن خوش چون بنگہ باز خورد آئینہ گوئی دلش از دست برد

دید کہ مہرہ و زیبا لہتم حیرت خویشم چہ تماشا لہتم

چہرہ برا فروخت ز تاب غدار یافت خزاں را سر و برگ بہار

ارٹ خیم پشت بہ کاکل رسید سلسلہ ناز بہ سنبل رسید

شوہر شش از وجد برقص افتاد دیدہ بہ گل چینی رویش کشاد

اس مقام پر بھی مرزا جوش بیان میں وہی غلطی کر گئے جو ایسے مواقع پر وہ کیا کرتے ہیں۔ یہ نامرنا قابل تسلیم ہے کہ ایک ایسی عورت جو افلاس کے ہاتھوں تباہ و خواہ ہو چکی ہو جب وہ اپنی دعا سے پھر جوان ہو جائے تو اس کے دل میں ایسے خیالات پیدا ہونگے گو یہ درست ہے کہ اس وقت اس کی خوشی کی کوئی انتہا نہ ہوگی۔ اسے ضرور اپنے حسن سے حیرت ہوتی ہوگی۔ مگر ان جذبات کی موجودہ ترتیب فطری ترتیب نہیں اور پھر یہ بھی محل عبث ہے کہ جنگل میں آئینہ کیسے دستیاب ہو گیا۔ شیشے میں جب اس کی نگاہ اپنے رخ پر نور پر پڑی۔ وہ خود اپنے حسن پر فریفتہ ہو گئی۔ اُس نے دیکھا کہ میں کس قدر رشک ماہتاب ہوں کتنی خوبصورت ہوں اور کس قدر تماشا گاہِ عالم ہوں۔ جب بوڑھے خاوند نے یہ عالم دیکھا تو خوشی سے ناچنے لگ گیا۔

نظر پڑنے کے لئے نگاہ باز خود نہ کہنا بہت ہی دلچسپ ہے۔ دوسرے مصرع میں، گوئی، کتنی بر خستگی اور بے ساختہ پن سے ادا ہوا ہے۔ مہ چہرہ کی ترکیب بہت عمدہ ہے اور دوسرے مصرع کی تو تعریف ہی نہیں ہو سکتی۔ اور پھر شوہر شش از وجد برقص افتاد بالکل نیچرل طرز بیان ہے۔ خوشی میں اگر انسان ناچتا ہے اور پھر ایسے قلاش کی خوشی اور بھی زیادہ پر لطف مناظر کی حامل ہوگی نگاہ شوق کو گل چینی سے تعبیر کرنا یقیناً گل ریزی ہے۔

جب وہ عورت از سر نو جوان ہو گئی تو وہ تھوڑی دور ہی گئے ہوں گے کہ ایک خوش نقاشا ہزارہ شکار کے پیچھے دوڑتا بھاگتا اوہرا نکلا۔ جب ان کی آنکھیں دوچار ہوئیں تو آنکھوں آنکھوں ہی میں ایک دوسرے سے بہت کچھ کہ گئے، چنانچہ موقع پا کر عورت نے جوان کو یوں مخاطب کیا کہ میں ایک غریب الوطن عورت ہوں راتے میں ان ڈاکوؤں کے ہاتھ لگ گئی ہوں میرے زیور وغیرہ سب اتارے گئے ہیں۔ صحبت ناجنس سے جان بلب ہوں۔ کیا آپ میری مدد کریں گے۔ جوان یہ سنتے ہی اسے اپنے پیچھے گھوڑے پر بٹھا کر روانہ ہو گیا

مرد اس موقع کی تصویر یوں کھینچتے ہیں۔

نالہ برآورد کہ اے نوجوان	داد نبل مہری ایں رہزناں
خوش کسم و ہچکسم کردہ اند	بلبلسم و در تقسم کردہ اند
زیور و پیرایہ من بردہ اند	بخودم از قافلہ آوردہ اند
زین غم و در دم بدر دل رسان	ہمراہ خود گیر و بمنزل رسان
خوش بغم خستہ روانا برس	نفر جوانا! بچوانا برس
بمرد جوانش بمرگاہ دست	داد پس خود بہ نگاہ دست

بر در دواں گشت رداں بچو باد گرو در ہش بر سر دہقان فتاد

شرفاً کو جب کوئی اس قسم کا حادثہ پیش آجاتا ہے اور وہ اس سے جانبر ہو جاتے ہیں تو حجب انھیں موقعہ ملتا ہے تو وہ سب سے پہلے اس پر اظہار افسوس کرتے ہیں کہ ان کی نہایت ہی بے حسرتی اور بے عزتی کی گئی۔ انہیں نہایت بڑی طرح پیٹا گیا ان کا اتنا نہ چھین لیا گیا۔ ان کے کپڑے اتار لئے گئے، وغیرہ وغیرہ مرزا نے بھی یہاں یہی طرز بیان پسند کیا ہے۔ اس لحاظ سے خوش کرم، ہیچکس کم کردہ اند، کس قدر مقتضائے حال کے مطابق ہے اور پھر شاہزادہ کے جذبات سے جس طریقہ پر اہل کیا گیا ہے وہ بھی کتنا معنی خیز ہے۔ اس میں خوش خستہ رداں، ناز جو انا، بچو اناں برس، وغیرہ تراکیب و الفاظ نہایت یا موقعہ استعمال ہوئے ہیں ناز جو انا کی ترکیب بہت ہی نادر و دلکش ہے

خستہ بخت دہقان کی سیاہ بختی کو کیسے عجیب پیرایہ میں بیان کیا گیا ہے کہ ”گرو در ہش بر سر دہقان فتاد“ مرزا کے ہاں عدت بیان کی ایسی مشا لوں کی بہت افراط ہے۔ جب ان کا سمند قلم جوش میں آتا ہے تو ایک نہایت ہی سادہ مضمون کو اپنے زور بیان سے سدرہ نشین کر دیتے ہیں۔ حق یہ ہے کہ یہ صنف شاعری جیسا مرزا کے ہاں پایا جاتا ہے اور کہیں اس کا عشر عشر بھی نہیں دیکھا جاتا۔ جامی کی غنوی یوسف زلیخا ایک عالم سے خراج تحسین وصول کر چکی ہے اور واقعی جس پایہ کی وہ کتاب ہے، فارسی علم ادب کے ذخیرہ میں اس پر اضافہ ناممکن ہے۔ نظامی نے لیلے و مجنوں اور فیضی نے بلقیس و سلیمان، لکھی ہیں، اور محبوب خوب زور طبع کی جولانیاں دکھائی ہیں۔ مگر ان کو۔۔۔ قوم کی نظروں میں عزت نہ پانا تھی۔ نہ پائی۔ اس سے نظامی اور فیضی کی شاعری پر کوئی حرف گیری نہیں ہو سکتی۔ فیضی جس پایہ کا آدمی تھا۔ آج دنیا چار سو سال آگے بڑھ چکنے کے بعد بھی کوئی ویسا انسان نہ پیدا کر سکی۔ نظامی کے سکندر نامہ کو شاہنامہ سے بھی زیادہ فروغ حاصل ہوا (گو مجھے ڈر ہے کہ علامہ شبلی مرحوم کے تلامذہ کے خلاف ہو گا۔ کیونکہ یہ ان کے مسلمات کے برخلاف ہے، لیکن حق کسی کے خاطر چھپایا نہیں جاسکتا)۔ اسی طرح اگر دنیا مرزا کے فارسی کلام سے اب تک غافل ہے۔ تو اس سے مرزا کی شاعری پر کوئی حرف نہیں آ سکتا۔ میں اس مقام پر مرزا کے کلام سے خوبی بیسان کی چند اور مثالیں پیش کئے بغیر نہیں رہ سکتا مرزا غنوی ”رنگ و بو“ میں ہندوستان کے ایک جوان دولت بادشاہ کا تذکرہ فرماتے ہوئے اس کی سخاوت اور کرم گستری کے متعلق یوں گہرا نشان ہوتے ہیں۔

”وہ جو دکر کم کا سمندر اور سخاوت اور انسان نوازی کا قلزم تھا۔ اس کی عام بندہ نوازی کے دروازے ہر کہ دمہ کے لئے کھلے ہوئے تھے اور ایک دنیا اس کے خوان کرم پر زندگی بسر کر رہی تھی وہ عظیم جود دکر کم تھا۔ ہمیشہ ہر شخص کی حاجت روائی کے لئے کمر بستہ تھا تھا۔ اور اس کی رحمت اور مہربانیوں کی بارشیں باغوں اور دیرانوں میں ایک ہی رفتار سے ہوتی تھی“

بادہ سرمستی دل رنج از ہم تر د بستی خود قلزم ہے

مائدہ گسترده بہ پہنائے آد
عالمی از برگِ نوازشِ باز
آئینہ صورتِ جود آ مدہ
جود خود از دوسے بوجود آ مدہ
بستہ کمر بہر کشتو دہمسہ
بودہ زبانِ خود و مسودہمسہ
دا بگل و خار جو آغوشش ابر
پیش کفش غاشیہ بردوش و بر
چرخ ز دستِ گہر افشان او
لطمہ خور موجہ طوفان او

ترجمہ سیدہ کاری کے معنوں میں آتی ہے۔ اسی پر قیاس کر کے تردستی سخاوت اور جود و کرم مراد لینا بہت اعلیٰ بات ہے۔ اور پھر بارہ دہم اور نم و فلزم کی لفظی صفت بھی کچھ کم قابل التفات نہیں بلکہ حق یہ ہے کہ اس شعر کی تعریف نہیں ہو سکتی۔ لوگوں کی حاجت روائی کرنا اور بے دریغ دولت لٹانا بلاشبہ اقتصادی نقطہ خیال سے اپنا سرمایہ تباہ کرنا ہے۔ مگر ان لوگوں کو اس سے کیا واسطہ جن کے ہاں ہمہ عالم ہو جو نے نے اور ذرا اسی خیال کو مرزا نے کیسے دلا دیز پیرا یہ ہیں اور فرمایا ہے۔ "بودہ زیان خود و سودِ ہمہ" بادشاہ کی عام بندہ فوازی کو ابر سے تشبیہ دینا ایک نیچرل تشبیہ ہے ہم کہتے ہیں۔ وہ سمندر سے بھی زیادہ سخی ہے وہ مجسم سخاوت ہے۔ اور حاتم ثانی ہے۔ مگر کیا کسی نے "آئینہ صورتِ جود" بھی سنا ہے؟

"ایک دفعہ کا واقعہ ہے کہ بادشاہ کا ابر کرم حسب معمول گہر زری میں مصروف تھا کہ اربابِ حوائج کے گروہ میں ایک خستہ حال گدا دیکھا گیا۔ آسمان کے مصائب اور زمانے کی تکالیف سے اس تیرہ سالان کی حالت ناگفتہ بہ تھی جو ایش عالم سے اس کا دل سینہ میں آگ کی طرح روشن تھا جس نے اس کے جسم کو جلا کر رکھ کر ڈالا تھا اسے زمانے نے کبھی چین سے رہنے نہ دیا تھا۔ اس کی ظاہری حالت اس کی شکستہ حالی و بے سرو سامانی کی ترجمان تھی ایک مصیبت اور سیاہ بختی کی شام اس کی بھاری بھر کم نخوست کے مقابلے میں بالکل ناقابل التفات تھی اور بومِ شوم سے اس کی تہہ کاری دو قدم آگے تھی"

تیرہ سرا انجام حریفے چو آہ
کرد سیاہی زور بار گاہ
چو لقی زہر بلا خوردہ
از یم طالع سر پا خوردہ
از تب و تابِ دل خویش آخرد
زیر لحافِ کف خاکسترے
بودہ خاکستر امضائے او
کلفتِ نظارہ سرا لے او
ہیچ گہ از بخت نیا مودہ
سر سیر آئینہ عرض شکست
چہرہ بگرد سفر اندودہ
کنہ گلیم و کدے بدست

طنزیات و اردو زبان

(یہ سلسلہ ماضی)

گالی گلوچ | ظاہر یہ عنوان بھی تشنوع سے ملتا جلتا ہے، مگر دراصل دونوں جدا جدا ہیں۔ تشنوع میں اور اس میں یہ فرق ہے کہ تشنوع میں کچھ جملہ ایسے بھی شامل ہوتے ہیں جو ادب و تہذیب کے خلاف ہوں مگر یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ فحش ہوں یا کلام کی بنیاد اس پر ہو مگر گالی گلوچ کی بنا ہی فحش پر ہوتی ہے وہ کلام ہے جس میں دو متخاصمین باہم فحش اور دور از تہذیب الفاظ سے ایک دوسرے کو مخاطب کریں۔ گالی کبھی کبھی صرف مخاطب کی ذات پر ختم ہو جاتی ہے اور کبھی اس کے اعزہ یا بزرگوں پر ختم ہوتی ہے۔ اس میں کسی تشبیہ، استعارے، طعن یا طنز کا شامل ہونا ضروری نہیں۔ بلکہ ایک فحش سچو ہے جس سے اپنے مخاطب کو صرف رنج پہنچانا مقصود ہوتا ہے صحیح یا غلط کی اس میں کوئی قید نہیں۔

گالی کبھی انتہائی حالت اشتعال میں قابل کی زبان سے نکلتی ہے۔ مگر یہ ضروری نہیں کہ ہمیشہ اشتعال ہی ہو بلکہ اکثر بغیر اشتعال کے بھی یہ سرزد ہوتی ہے اس کی مثال تلاش کرنا ایک غیر ضروری اور فضول بات ہے اس واسطے کہ دور موجودہ کی بیباک روی نے اس کو اتنا عام کر دیا ہے کہ ہر گلی کوچہ میں ڈھونڈنے والے کو بغیر زحمت تلاش کے اس کی دس بیس مثالیں مل سکتی ہیں۔

استعرا | جس کے لغوی معنی تسخیر کرنا، مذاق اڑانا، کسی کو بے وقوف بنانا ہیں، عرف عام میں اس کو صرف بنانا کہتے ہیں۔ بنانے کی صورتیں مختلف ہوتی ہیں جن کو یہ تفصیل ہم اس بحث میں لکھینگے پہلے بنانے کے معنی بیان کرتے ہیں۔ کسی شخص کی تقریر یا تحریر کو غلط جانکر، یا اس کے افعال کو برا سمجھ کر بطور تجاہل عارفانہ کے ایسے الفاظ استعمال کرنا جس سے اس کو انہو افعال و اقوال پر نیکیوں اور اچھائیوں کا دھوکہ ہو اور وہ خوش ہو جائے۔ مثلاً ایک مرتبہ نواب سادات علیخان کے دربار میں سعدی کے اس قطعہ کے مصرع چہارم پر بحث تھی

تا مرد سخن نگفتہ باشد عیب و ہنرش نہفتہ باشد

ہریشہ گماں میر کہ خالی است شاید کہ پلنگ خفتہ باشد

سعدت علی خان کہتے تھے کہ خفتہ باشد ہے۔ مگر علی نقی خاں جان بیلی صاحب رزیدنٹ کے میر منشی کہتے تھے

کہ خفیہ باشد ہے۔ سعدت علی خان نے انسا کی طرف دیکھا انشانے اذراہ تمسخر کہا کہ حضور میر منشی صاحب بالکل صحیح فرماتے ہیں غلام نے بھی ایک نسخہ گلستاں میں یونہی دیکھا ہے کہ

تا مرد سخن نگفتہ باشد عیب و ہنرش نہفتہ باشد

ہریش گماں مبرکہ خالی است شاید کہ پلنگ خفیہ باشد

بلکہ وہ نسخہ بہت صحیح اور محشی تھا اس میں گفیہ اور نہفیہ کے کچھ معنی بھی لکھے تھے۔

ظاہر ہے کہ انشاء بات جلتے تھے کہ گفتہ نہفتہ خفتہ، سب قوافی ہیں اور صحیح ہیں مگر استہزا کے طریق پر تجاہل کر کے میرشی صاحب کو بنانے کے لئے یہ کہا۔

ایسے ہی اورچ غالب ذوق وغیرہ کے معاصر تھے۔ وہ ایک معمولی بلکہ غلط گو شاعر تھے جب غالب کو شعر سناتے تھے تو مرزا کہتے تھے کہ ”واٹھر کیا خوب“ وہ لوگ کافر ہیں جو تم کو شعر گوئی کا استاد جانتے ہیں۔ شاعری کے خدا ہو خدا یہ کہہ کر دوسرا شعر سنتے اور سبحان اللہ کہہ کر سجدہ کرنے کے طریقہ پر گردن جھکا لیتے تھے۔

کبھی استہزا اس طریقہ سے کیا جاتا ہے کہ ایک دوسرا واقعہ دوسرے کو مخاطب بنا کر یا بغیر خطاب کے کہتے ہیں اور اصل میں مقصود کسی اور کو بنانا اور کسی دوسرے واقعہ پر اس کو شرمانا ہوتا ہے۔ کہتے کچھ اور ہیں اور مطلب کچھ اور لیتے ہیں۔ جیسے نعمت خان عالی نے اراکین شاہی اور خود اور نگرین عالمگیر پر اس قصیدہ میں استہزا کیا ہے۔

معراج و سلم آمدہ زینہ بہت کند زیں ہر دو بیچ کا نیاید بالنصرام

ظاہر نعمت خان عالی، الفاظ کے معنی بیان کرتا ہے کہ معراج اور سلم زینہ کو کہتے ہیں اور دھن کند کو، مگر ان دونوں سے انتظامی معاملات میں کوئی کام نہیں نکلتا۔ اور دراصل اس واقعہ پر بادشاہ اور فیروز جنگ بہادر کو بنایا گیا ہے، کہ انھوں نے شجوں کے طریقہ پر قلعہ گو لکندہ پر ایک کو کند اور زینہ لگا کر دیوار قلعہ پر چڑھنا چاہا تھا۔ مگر قلعہ میں خبر ہو گئی اور اٹا انھیں پر حملہ ہو گیا اور فوج شاہی نہایت ناکامی کے ساتھ پسپا ہو گئی۔

الکسر والسقوط شکستین قتل است آنم شد و حصار نیفتاد از نظام

مطلب ظاہری یہ ہے کہ کسر ٹوٹنے اور سقوط گرنے کو کہتے ہیں۔ یہ سب کچھ ہو گیا مگر حصار کا نظام برقرار رہا مگر دراصل کہا یہ گیا ہے کہ کندین جب کاٹ ڈالی گئیں اور زینہ والوں پر جب حملہ کیا گیا تو یہ لوگ گرے بھی، ہڈیاں بھی ٹوٹیں، مگر شرم نہیں آتی کہ اب تک حصار کئے ہوئے پڑے ہیں۔ نعمت خان عالی کے یہاں دقایق میں اکثر قصیدہ اسی قسم کے ہیں بخون طوالت ہم سب کو لکھنے سے مجبور ہیں کبھی کبھی صرف تسخیر کرنا مقصود ہوتا ہے۔ مثلاً ایک شہور شعر ہے کہ

ہزار شیخ نے ڈاڑھی بڑھائی سن کی سی مگر وہ بات کہاں مولوی مدن کی سی

اس میں صرف شیخ اور مولوی مدن پر استہزا کیا گیا ہے۔ اسی طرح یہ شعر ہے

سمجھا کہ سر پہ رکھ کے مرا چاک لے چلے وڑا کہہ مار شیخ کی دستار دکھ کر

اس میں تسخر کے ساتھ شیخ کے اہمق کا بھی اظہار کیا گیا ہے یا یہ شعر ہے

شیخ نے مانگی ہے اپنے وقت کی میکندے سے اب پُرانی جائیگی
شب ماہ کا لطف اور شیخ جب ہے کہ ہالابنے تیری پگڑی اچھلکر
مغرب نے خرد بین کمرانی دیکھ لی مشرق کی شاعری کا مزہ اکر کر اہوا
زاہد کو ایک قطرہ زمزم پہ تازہ ہے یان خم کے خم اڑا رہی ہیں بیرمغاں کیتھا
انہیں لوگوں کے آنے سے تو میخانہ کی غفلت ہے قدم تو شیخ کے تشریف لایا بادہ خواہوں میں

غالب طنز کو استہزا میں شریک کرتا ہوا کہتا ہے

مومرز ہادکن عرض کہ اس جو ہر ناب پیش این قوم بہ شور ابہ زمزم نرسد
دوسرے مصرع میں صرف استہزا اور تسخر ہے۔ قوم۔ شور ابہ زمزم۔ عجیب عجیب استہزا کی صورتیں پیدا کر رہے ہیں اور سا
ایک طنز بھی شامل ہے۔ کسی جگہ مخاطب کو حماقت کا احساس کر کے اس پر استہزا کیا جاتا ہے جیسے اکبر کا یہ شعر۔
بڈھومیاں بھی خیر سے گاندھی کے ساتھ ہیں گوشت خاک ہیں مگر آندھی کے ساتھ ہیں

کہیں استہزا اظہار واقعات کی صورت میں کیا جاتا ہے جیسے ریاض صاحب کہتے ہیں
جناب شیخ نے پی اور منہ بنا کے کہا مزا بھی تلخ ہے کچھ بو بھی خوشگوار نہیں
بیخود دہلوی پی کے زاہد نے مونا ب یہ ارشاد کیا اس کا انگور کے شربت میں مزا ملتا ہے
کا مگار خاں پسر دم عمدۃ الملک جعفر خاں وزیر اعظم بادشاہ عالمگیر ایک سادہ مزاج آدمی تھے انھوں نے جب حیدر آباد
فتح ہوا تو ابوالحسن تانا شاہ والی سابق دکن کے وزیر ناکتھالڑکی کے ساتھ شادی کی نعمت خاں عالی نے استہزا کے طریق پر
قصیدہ لکھا جس کے ہر ہر لفظ سے استہزا ٹپکتا ہے۔

عرفی اور فیضی میں کچھ چشمک ہو گئی تھی اس پر طرہ یہ ہوا کہ عرفی سے کسی ستم ظریف نے یہ کہہ دیا کہ عرفی تم کو اپنا شاگرد بتاتا ہے اسی
عرفی نے یہ رباعی کہی اور فیضی کا تسخر کیا۔

اخوند من اند کے زانصا کجاست در دتوبے ہست موصاف کجاست
این بے ادباں از تو سوائے دارند عنقائے فضیلت ترا قاف کجاست

انشاد انشراح انشانے ایک مکان پر یہ تاریخ لکھی ہوئی دیکھی ہے

حویلی علی نقی خان بسا در کی

چونکہ یہ مصرع موزوں نہ تھا لہذا تسنیر کے طریقہ پر آپ نے اس کو دو بیتوں میں یار باعی کی صورت میں کر دیا اور کہا ہے

تال کی نہ سسم کی نہ سُر کی فارسی نہ عربی نہ ترکی
تاریخ کئی ہوئی ہے کیسی لڑکی حویلی علی نقی خاں بہادر کی
ایک شاعر نے اتفاق سے بجائے اجناس کے اجنا نظم کر دیا۔ یعنی سین گر گیا انشا یہ واقعہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں
اجناس کے موقع پر اجنا آیا سلمائے علوم کا یہ سنجبا آیا
اجنا چیز ہے است کاں برویدہ ہیں ہو تخم نعت کا تو اپنجا آیا

دوسری رباعی دیکھئے وہ بھی اسی رنگ میں ہے۔

دستار نعت تمھیں نہ سنجبا آیا اجناس میں کو دیکھو کمر اجنا آیا
اجنا کوئی ڈھول دالہ ہوگا اسکا کاغذ میں کہاں سے ڈھولنخا آیا

اسی قسم کی اور کئی رباعیاں انھوں نے کہی ہیں جس میں بچارے غلطی کرنے والے کو خوب خوب بنایا ہے تسنیر جس سے کسی کو بنایا جاتا ہے کبھی اس طرح بھی ہوتا ہے کہ اپنا عجز بیان کیا جائے اور دوسرے کو اپنی حرکات یا اقوال سے برتر ثابت کیا جائے۔ مگر دراصل اس شخص کو بیوقوف بنانے کا ارادہ کیا جاتا ہے جیسے انشا راشد خان انشا ایک جگہ کہتے ہیں :-

خیال کیجئے کیا آج کام میں نے کیا جب اسودی مجھے گالی سلام میں نے کیا

سلام کرنا ایک ایسی حرکت ہے جو بظاہر اپنے آپ کو عاجز اور دوسرے کو برتر ثابت کرتی ہے مگر دراصل گالی دینے والے کو اس صورت سے بنایا گیا ہے۔ پایہ شعر بالکل اسی انداز کا ہے

مجھ میں ایک عیب بڑا ہے کہ وفادار ہوں میں تم میں دو وصف ہیں بد خو بھی جفا کار بھی ہو

کبھی تسنیر اور استہزا اس طریقہ سے کیا جاتا ہے کہ اپنے کو مکمل طریقوں سے بدتر ثابت کیا جاتا ہے اور اس سے نتیجہ یہ مرتب کیا جاتا ہے کہ دوسرے کو ذلیل ثابت کیا جائے۔ اور آواز کی سی ایک صورت پیدا کر دی جائے جیسا کہ جعفر زٹلی نے اپنے کسی حرف میں کو یہ ثنوی کہہ کر بنایا ہے

من آں رستم وقت رو میں تنم کہ وہ پا پڑ از مشمت خود بشکنم

یہ پوری ثنوی تیس چالیس شعروں کی ان کے کلیات میں موجود ہے۔

طنز کی یہ بھی ایک قسم ہے۔ جلال مرحوم سرمایہ زبان میں اس کے معنی صرف تشبیہ کے لکھتے ہیں۔ غالب مرحوم بھی تشبیہ پرہیزی اور پرہیزی میں کوئی فرق نہیں کرتے مگر دراصل یہ ایک غلطی ہے پرہیزی کوئی تشبیہ نہیں ہے بلکہ استعارہ ہے جس کی

ہمارے بحث کے موافق تعریف کیجا سکتی ہو کہ کسی کو دیکھ کر اس کے حسب حال دفعتاً کوئی چھپتا ہوا مختصر فقرہ کہنا جو اسپر ہیپ جائے یعنی کسی شخص کو کوئی دوسری چیز فرض کر لیا جائے اور مستعار لہجے سے مستعار منہ ہمیشہ بدتر ہو جس چیز سے استعارہ کیا جائے اس کی بدتری کی وجہ سے وہ شخص جیسر ہیبتی کہی گئی ہے بدتر معلوم ہونے لگے۔

جس استعارہ میں ظرافت اور ہجو کا جزو غالب ہو اسی کو ہیبتی کہا جائے گا۔ ہیبتی کی اقسام مختلف ہیں کبھی ہیبتی کسی شخص کی ذات پر کہی جاتی ہے اور کبھی اس سے صفات پر روشنی ڈالی جاتی ہے اور ایک چھوٹا سا جملہ اس شخص کے اکثر حالات کا ایک آئینہ ہو جاتا ہے جیسں دہندی دہندی بہت سی تصویریں نظر آتی ہیں ایسی ہیبتی کو تشبیہ نام کے درجہ پر رکھا جائے گا۔ مثال کے لئے ملاحظہ فرمائیے۔

اشرف علی خان فغاں، ناگرمل دیوان تن پر کو جوان کی معاصر اور امرائے شاہی میں سے تھے (گھی کی منڈی کا سانڈ) کہتے تھے اس ہیبتی کے سنتے ہی ناگرمل کی ایک تصویر آنکھوں کے سامنے پھر جاتی ہے کہ ناگرمل ایک بھتہ اور عقل و خرد سے بے بہرہ انسان ہے اسی طرح حکیم معصوم اشرف علی خان فغان کے معاصر تھے چونکہ غریب میں کچھ ظاہری نمائش نہیں تھی، ایک بھولے بھالے فریبہ جسم کے آدمی تھے، فغاں نے انپر ”گاؤ گجراتی“ کی پھیبتی کہی۔

رشید الدین ایران کا ایک نہایت مشہور و معروف شاعر گزرا ہے۔ اتفاق سے وہ پستہ قد اور حقیر تھا خاقانی یا اور کسی بڑے آدمی نے اسپر (وطواط) کی ہیبتی کہی وطواط ایک بہت چھوٹا سا پرند ہوتا ہے مگر اس کی زیر کی مشہور ہے۔ یہ ہیبتی کچھ ایسے مبارک وقت میں کہی گئی تھی کہ رشید الدین کے ساتھ لفظ وطواط ہمیشہ کے لئے شامل ہو گیا۔ اور آج تک رشید الدین وطواط نہ کہا جائے کوئی رشید کو سمجھ نہیں سکتا۔

ایک رئیس نے گبن نامی طوائف کو اس وقت ملازم رکھا جب وہ صحیح طریقہ سے سن شعور کو بھی نہ پہنچی تھی ایک دوست نے رئیس صاحب سے کہا کہ ابھی تو یہ پوری گبن بھی نہیں ہوئی۔ ”ادھا گبن“ ہیں انکو کر رکھنے سے قائدہ۔ یہ ہیبتی اس قدر مقبول ہوئی کہ آج گبن ہر جگہ ادھا گبن ہی کے نام سے مشہور ہے۔ کبھی کبھی ہیبتی سے صرف وصف خاص پر روشنی پڑتی ہے شیخ شرف الدین مضمون کے دانت گر گئے تھے اس لئے خالق آرزو اُن کے استاد نے ایک مرتبہ انپر (رشاعر بیدار نہ) کی ہیبتی کہی

خدمت گار خان ایک خوبہ تھا اُن سے اور اُبرو سے کچھ چشمک ہو گئی تھی اس لئے اُبرو نے یہ شعر کہ کر ہیبتی کہی۔

یارو خدمتگار خاں خوشی کے بیچ ہے تو مستثنیٰ، لیکن منقطع

بقا نے شیخ چلہ نشین پر پہ قطعہ کہ کر ہیبتی کہی۔

توبہ زاہد کی توبہ تلی ہے چلے بیٹھے تو شیخ چلی ہو

دماغ مرحوم ایک سیاہ رنگ جھپک رو آدمی تھے جب رامپور میں تشریف لائے اور صطبل کی خدمت ان کے سپرد ہوئی تو لوگوں نے
شکلی کی بہتی اسپر کی

شیخ ناسخ ایک بسیار خواہلوان آدمی تھے آزاد نے لکھا ہے کہ لوگ ان پر دم گنا بھینسا کی بہتی کہتے تھے۔
چنان لکنو کے ایک ظریف شاعر تھے اپنے رقیب کو وصل معشوق سے کامیاب دیکھ کر بہتی کہتے ہیں
پہلو حور میں لنگور خدا کی قدرت زراغ کی چوبچ میں انگور خدا کی قدرت

سجاد حسین مرحوم اپنی تصنیف احمق الذین میں نواب احمق الذین پر اس وقت جب مس اسمتہ نے ان پر ناش کی اور وہ
قطعاً مفلس ہو گئے نواب تحت اللفظ کی بہتی کہی۔

ایک ریاست کے دیوان پر جو مد منشرع مگر نہایت خشک آدمی تھے ایڈیٹر اودھ پنچ منشی سجاد حسین نے (حاریاں)
بہتی کہی۔ اسی طرح احمق الذین نے اس جگہ جہاں بھولے نواب نے اپیل کرنی چاہی ہے اور قاضی صاحب نے منظور نہیں کی
اور یہ وہاں سے ناکام پلٹے تو ان پر (دعائے مستجاب) کی بہتی کہی ہے۔

حاجی بخلول کی ریش مبارک نوکدار مگر اجڑی ہوئی سی تھی لہذا اس پر (پُرانی کوپچی) کی بہتی کہی گئی۔ اسی طرح حاجی
بخلول کے رونے اور قطرات اشک کے آنکھوں سے نکلنے پر بہتی کہی گئی کہ ”تمباکو پنڈے پر لگی ہوئی کوڑیوں سے شیرہ بہا“ بلبی لمبی
سانسیں لینے سے جو حاجی بخلول کا پیٹ پھوٹا تھا اسپر (لہار کی کھال) کی بہتی کہی گئی۔ حاجی بخلول کے ایک جگہ فرش پر
ڈھیر ہو گئے تو بہتی کہی کہ (چھاپے کی روشنائی سل پر پھیل گئی)۔ حاجی بخلول چلتے چلتے ایک جگہ گر کر بیہوش ہو گئے ہیں ان کے
مصاحب خاص حنفیہ ریوڑی پاس بیٹھے ہوئے ہیں۔ وہاں پر ایڈیٹر اودھ پنچ نے بہتی کہی ہے مری بھینس کے قریب چمر گد۔

ایک بیرسٹر صاحب ضعیف ہو کر دہرے ہو گئے تھے اُن پر ایڈیٹر اودھ پنچ نے خط منحنی کی بہتی کہی۔ حاجی بخلول کے
تیز چلنے پر بہتی کہی کہ (ڈھیلکی کرتے ہوئے جارہے تھے) اسی طرح میں ایک مرتبہ بازار میں جارہا تھا دیکھا کہ ایک لنگڑے بنگالی بابو
بہت تیزی سے تشریف لے جا رہے ہیں میرے ساتھ ایک دوست بھی تھے انھوں نے بابو صاحب کی چال پر یہ بہتی کہی کہ (بابو صاحب
ٹائپ کرتے جارہے ہیں) ایک جگہ حاجی بخلول کی بچکی بندھ گئی سجاد حسین مرحوم نے اس کو (سینہ میں ڈھیلکی چلنے لگی) کہا

لکنو کے شاعر مرحوم جو نہایت ہی کریم المنظر سیہ فام بدہمت شخص تھے ایک مرتبہ ایک بچہ کو کھلا رہے تھے خود بیٹے
ہوئے تھے اور بچہ کو سینہ پر بٹھا رکھا تھا ان کے ایک دوست نے بہتی کہی۔ (نور دُور پر سوار ہے)۔ پنڈت رتن ناتھ شرما
اپنی تصنیف خدائی فوجدار میں لکھتے ہیں کہ خدائی فوجدار کا گھوڑا چونکہ بہت دبلا تھا لوگ اسپر پتیاں کہتے تھے (پہلے لگوائے
تو چلے، بہی داہرے مکھار کیا گھوڑا بنایا ہے) خدائی فوجدار کی صورت دیکھ کر ایک نے بہتی کہی (قبر کی پہلی منزل سے بھاگے ہیں)

ہر قسم کا عطر صغریٰ علی محمد علی تاجر عطر لکنو سے منگائیے

تہ خانے کا راز

(فانہ)

شرلاک ہومز دیر سے خوردین پر جھکا ہوا تھا۔ اب اُس نے سیدھے ہو کر میری طرف دیکھا۔

— ”وائسن یہ گوند ہے“ بلاشبہ یہ گوند ہے۔ ذرا تم بھی ان ریزوں کو دیکھو“ میں خوردین پر جھکا اور اپنی نظر کی مناسبت سے اسے ترتیب دیا۔

— ”یہ جو بال ہیں یہ ایک اونٹنی کوٹ کے تار ہیں، بھورے بھورے ڈلے مٹی کے ہیں، اور درمیان میں جو زرد زرد ریزے ہیں وہ یقیناً گوند کے ہیں“

— ”خیر میں آپ کے دعوے کو تسلیم کرنے کے لئے تیار ہوں کیا کسی مسئلہ کا انحصار اس پر ہے؟“

— ”یہ بہت اچھا ثبوت ہے تمہیں یاد ہو گا کہ سینٹ پینکرا والی داروات میں ایک ٹوپی مقتول سپاہی کے قریب سے ملی تھی۔ ملزم نے انکار کیا تھا کہ وہ اس کی نہیں ہے۔ لیکن وہ تصویروں پر فریم چڑھانے والا ہے اور اسے اکثر گوند سے کلام پڑتا ہے“

— ”کیا تم اس معاملے کی تفتیش کر رہے ہو؟“

”نہیں بلکہ میری دلی نے جو پوس کا ملازم اور میرا دوست ہے مجھ سے اس معاملے میں مدد چاہی ہے جب سے میں نے اس کے بنانے والے کو تانبے کے ان ذرات کے ذریعے سے

— جو اس کے کف کی سیوں میں پائے گئے تھے پکڑا ہے تب سے پوس والے خوردین کی قدر و قیمت سے واقف ہو گئے ہیں“ یہ کہہ کر اُس نے اپنی گھڑی دیکھی اور بولا ”مجھے ایک شخص کے آنے کی امید تھی مگر اس کا وقت گزر گیا ہے اور وائسن تمہیں گھوڑ دوڑ کی بابت کچھ معلوم ہے؟“

— ”ہونا تو چاہئے۔ میں اپنی بنش کا نصف حصہ جو مجھے زخمی ہونے کی وجہ سے ملتی ہے گھوڑ دوڑ میں صرف کرتا ہوں“

— ”سر رابرٹ ناربرٹن کا نام کوئی یاد تھا؟“ دل میں تانہ کرتا ہے۔ ”ضرور کرتا ہے۔ وہ شاسکب کے محل میں رہتے ہیں اور میں اس جگہ کو اچھی طرح جانتا ہوں کیونکہ میں موسم گرما میں وہاں ٹھہرا تھا۔ اور ایک مرتبہ تو سر رابرٹ قریب قریب قانونی حدود میں پھنس گئے تھے“

— ”وہ کیونکر؟“

— ”وہ یوں کہ ایک مرتبہ انھوں نے سام بر دور کورن اسٹریٹ کے مشہور سا ہوکار کو خوب زد و کوب کیا اور قریب الموت کر دیا۔“

— ”خوب خوب۔ کیا وہ اکثر اسی قسم کا شوق فرماتے ہیں؟“

— ”اس میں شک نہیں کہ وہ ایک مخدوش آدمی ہیں۔“

انگلستان بھر میں سب سے خوف دوا کھیلنے والے ہیں چند سال گزرے ان کا گھوڑا گرانڈ انٹرنیشنل میں دوسرے نمبر پر

آیا تھا وہ ان آدمیوں میں سے ہیں جو اپنے حسب حال زمانہ گزر جانیکے بعد پیدا ہوئے۔ اگر وہ اونیسویں صدی کے شروع میں جب جارج چارم اپنے باپ کے بجائے حکومت کو ہاتھ پیدا ہوتے تو خوب بنتی کیونکہ وہ بڑے ماہر گھونے باز، پہلوان، دوڑ کھیلنے والے اور عاشق مزاج آدمی ہیں۔ یہ بھی ہر جگہ افواہ ہے کہ وہ قرض کے جال میں ایسے پھنسے ہوئے ہیں کہ کلنا مشکل ہے۔

”اچھا اب تم ذرا شاسکب کے محل کا نقشہ تو بتاؤ۔“

”محل باغ کے درمیان واقع ہے اور اس کے مشہور صطیل وغیرہ بھی وہیں ہیں۔“

”اور داروغہ صطیل غالباً مسٹر جان ملین ہیں۔ میری اس واقفیت پر حیران ہونے کی کوئی وجہ نہیں کیونکہ یہ خطہ جسکو میں کھول رہا ہوں انھیں کا بھیجا ہوا ہے۔ شاسکب کے بارے میں کچھ اور بتاؤ۔“

”شاسکب کے مشہور کتے ہیں۔ کتوں کی نمائش میں تم نے بھی ان کا تذکرہ کیا ہو گا۔ انگلستان میں خالص ترین نسل ہے اور شاسکب کے محل کی مالکہ بجا طور پر انیسویں فخر کرتی ہے۔“

”شاسکب کے محل کی مالکہ سر رابرٹ ناربرٹن کی بیوی ہوگی۔“

”سر رابرٹ نے کبھی شادی نہیں کی اور یہ اچھا ہوا کیونکہ انکی موجودہ مالی حالت اچھی نہیں۔ وہ اپنی بیوہ بہن لیڈی فارلڈر کے پاس رہتے ہیں۔“

”یعنی انکی بیوہ بہن لیڈی فارلڈر ان کے پاس رہتی ہیں؟“

”نہیں وہ محل ان کے شوہر مرحوم سرجیس کا ہے اور ناربرٹ کا اسپر کوئی حق نہیں ہے۔ لیڈی فارلڈر تاحین حیات اسپر قابض ہیں۔ بعد وہ سرجیس کے بھائی کو ملیگا۔ فی الحال

جانکد کی کل آمدنی لیڈی فارلڈر کو ملتی ہے۔“ اور غالباً رابرٹ اس آمدنی کو خرچ کرتے ہونگے۔“

”ہاں قریب قریب یہی بات ہے۔ رابرٹ بڑے حضرت ہیں۔ اور ان کی بہن کی جان ان کے ہاتھوں ضرور ضیق میں ہوگی میں نے سنا ہے کہ لیڈی فارلڈر کو ان سے بہت محبت ہے۔ لیکن آخر شاسکب میں غیر معمولی بات کیا ہے۔“

”یہی میں بھی معلوم کرنا چاہتا ہوں اور میں امید کرتا ہوں کہ آدمی جو ہمیں بتا سکتا ہے آ رہا ہے۔“

اتنے ہی میں دروازہ کھلا اور ملازم نے ایک طویل قامت آدمی کو داخل کیا جس کی داڑھی موچھ صاف تھیں اور جس کے چہرے سے ایسا استقلال اور سکون ٹپکتا تھا جو صرف سائیسون اور گہوڑوں کی نگہداشت کرنے والوں کے لئے مخصوص ہے۔ جان میں گھوڑوں اور سائیسون کی کافی تعداد اپنے زیر حکومت رکھتا تھا اور وہ اس فرض کی انجام دہی کا اہل معلوم ہوتا تھا۔ اس نے نہایت اطمینان سے سلام کیا۔ ہومز نے ایک کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور وہ بیٹھ گیا۔

”مسٹر ہومز آپ میرا رقعہ مل گیا تھا؟“

”جی ہاں۔ مگر اس سے کسی بات کی تشریح نہ ہوتی تھی۔“

”معاذ کی نزاکت ہی اس بات کی متقاضی تھی کہ معرض تحریر میں نہ لایا جائے میں اسے زبانی ہی بیان کر سکتا ہوں۔“

”ہم لوگ آپ کی خدمت میں حاضر ہیں۔“

”مسٹر ہومز سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ میرے مالک سر رابرٹ پاگل ہو گئے ہیں۔“ ہومز نے تیوری چڑھائی۔ ”جناب

یہ تو بیکر سٹریٹ ہے اور پاگل خانہ ہمارے اسٹریٹ میں ہے مگر یہ آپ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ وہ پاگل ہو گئے ہیں۔“

— جب کوئی آدمی ایک یا دو عجیب حرکتیں کرے تو خیر اس کے لئے کوئی وجہ بھی ہو سکتی ہے۔ لیکن جب اس کا ہر فعل عجیب ہو تو دیوانہ بن کا گمان کیوں نہ ہو۔ میرا خیال ہے کہ ڈربہ کی گھوڑ دوڑ اور شاسکب پرنس کے خیال نے انکا دماغ خراب کر دیا ہے۔“

— ”شاسکب پرنس“ اس گھوڑے کا نام ہے جو آپ کی طرف سے دوڑ رہا ہے؟“

— ”سٹر ہومز وہ انگلستان کا بہترین گھوڑا ہے۔ اگر کسی کو اس بات کا علم ہے تو جھکے ہوئے ہیں۔ میں آپ سے صاف صاف بیان کر دوں گا کیونکہ میں جانتا ہوں کہ آپ معتبر آدمی ہیں اور یہ باتیں ہم ہی تک محدود نہیں گئی۔ سر رابرٹ کو ڈربہ کی یہ دوڑ ضرور جیتی چاہئے۔ پانی ان کے گلے گلے ہے اور یہی ان کا آخری موقع ہے۔ وہ جو کچھ قرض لیتے ہیں اسی گھوڑے پر لیتے ہیں اور آج کل بازی بھی اس گھوڑے کی زبردست ہے۔ لوگ ایک ایک کے چالیس دینے کے لئے تیار ہیں اور جب اسے داخل کر کے بازی لگانا شروع کی تھی تو ایک ایک کے سو سو تھے۔“

— ”لیکن اگر گھوڑا اس قدر اچھا ہے تو ایسا کیونکر ہو سکتا ہے؟“

— ”عوام کو معلوم نہیں ہے کہ وہ کیسا عمدہ گھوڑا ہے۔ سر رابرٹ عام لوگوں سے بہت چالاک ہیں۔ وہ اس گھوڑے کے بھائی کو سلانے کے لئے نکالتے ہیں اور ان دونوں میں بالکل فرق نہیں ہے۔ شناخت ناممکن ہے۔ لیکن صرف ایک فلائنگ کی دوڑ میں پرنس اسے خود بانس سے مایہ سکتا ہے۔ آج کل سر رابرٹ

کو گھوڑے اور دوڑ کے سوا کسی بات کا خیال نہیں ہے انکی زندگی کا دار و مدار اسی پر ہے۔ دوڑ کے وقت تک سر رابرٹ نے قرضہ ہمارے ہاں جنوں کو روک رکھا ہے۔ اگر پرنس ہار گیا تو خیر نہیں ہے۔“

— ”اس میں شک نہیں کہ نہایت بیباکانہ بازی لگ رہی ہے مگر اس میں پاگل پن کا کیا ذکر؟“

— ”سب سے پہلے ان کی صورت۔ مجھے یقین نہیں کہ وہ رات کو سوتے ہیں۔ وہ وقت ہو یا بیوقت صطبل میں موجود رہتے ہیں، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کے حواس خراب ہو گئے ہیں۔ پھر ان کا برتاؤ لیڈی فالڈر کے ساتھ۔“

— ”وہ کیسا ہے؟“

— ”ہمیشہ سے ان کے گھرے دوستانہ تعلقات تھے۔ دونوں ایک ہی مذاق کے تھے اور لیڈی فالڈر بھی گھوڑوں سے ایسی ہی محبت کرتی تھیں جیسی کہ رابرٹ۔ وہ ہر روز کسی نہ کسی وقت گھوڑوں کو دیکھنے گاڑی میں سوار ہو کر آتی تھیں اور سب سے زیادہ محبت انہیں ”پرنس“ سے تھی۔ سڑک پر انکی گاڑی کے پیروں کی آواز سن کر پرنس کے بھی کان کھڑے ہو جاتے تھے اور وہ روزانہ خود جا کر ان کے ہاتھ سے کچھ نہ کچھ چیز کھاتا تھا۔ مگر اب یہ باتیں خواب و خیال ہو گئیں۔“

— ”کیوں؟“

— ”ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انھیں گھوڑوں سے دلچسپی ہی نہیں رہی ایک ہفتہ سے وہ روزانہ صطبل کے سامنے سے گاڑی میں گزرتی ہیں مگر بات تک نہیں پوچھتیں۔“

— ”آپ کا خیال ہے کہ باہمی نزاع ہو گیا ہے؟“

— ”اور نزع بھی نہایت شدید اور تلخ۔ ورنہ وہ لیڈی فالڈر کے ہالتو کو جسے وہ اپنے بچے کی طرح عزیز رکھتی تھیں کیوں الگ کرتے چند روز ہوئے انھوں نے وہ کتا بارس کو دیدیا جو گرین ڈریگن نامی سراے کا مالک ہے۔“

— ”یہ بات یقیناً عجیب معلوم ہوتی ہے۔“

— ”یہ صحیح ہے کہ مرض استسقا اور کمزوری قلب میں مبتلا ہوتے ہوئے لیڈی فالڈر سے یہ امید تو نہ تھی کہ وہ عرصہ تک نباہ سکیں گی۔ لیکن اس سے قبل دونوں روز شام کو دو گھنٹے باہم صرف کرتے تھے اور وہ ان کی بہترین رفیق ثابت ہوئی تھیں لیکن اب یہ بات نہیں ہے۔ اب وہ ان کے پاس بھی نہیں جاتے اور لیڈی فالڈر کچھ متفکر اور پریشان سی رہتی ہیں۔ غم غلط کرنے کے لئے اب وہ شراب پینے لگی ہیں۔“

— ”کیا اس رنجش اور کشیدگی سے پہلے بھی دھڑپتی تھیں؟“

”ہاں لیکن بہت قلیل مقدار میں۔ مگر اب تو روزانہ ایک بوتل خالی ہوتی ہے۔ یہ مجھے بٹلر سے معلوم ہوا۔ یعنی صورت حال ہی بدل گئی ہے اور کچھ نہ کچھ بھید ضرور ہے۔ اس کے علاوہ آخر وہ رات کو گر جا کے تہ خانے میں کیا کیاتے رہتے ہیں؟ اور وہ کون آدمی ہے جو ان سے رات کو وہاں ملتا ہے؟“

— ”ہومز نے اضطراب سے ہاتھ ملنے شروع کئے۔“

— ”مسٹر مین آپ کہے جائے۔ آپ کا بیان دھپپ ہوتا جا رہا ہے۔“

بٹلر نے ان کو جاتے ہوئے دیکھا۔ رات کا وقت تھا اور سخت بارش ہو رہی تھی۔ پچھلی رات کو میں بھی مکان پر بیدار رہا اور سربراہٹ کو میں نے جاتے دیکھا۔ بٹلر اور میں ان کے پیچھے چلے مگر یہ حرکت تھی

خطرناک کیونکہ اگر وہ ہمیں دیکھ لیتے تو کہیں ٹھکانا ہی نہ تھا وہ گھونٹہ بازی کے لحاظ سے مخدوش آدمی ہیں اس لئے ہم قریب جاتے ہوئے تو گھبراے مگر ہم نے ان کو نگاہ میں رکھا۔ وہ تہ خانے کی طرف جا رہے تھے۔ اور ایک آدمی وہاں انکا انتظار کر رہا تھا۔“

— ”یہ تہ خانہ کیا بلا ہے؟“

”یاد میں ایک پُرانا منہدم کر جا ہے۔ وہ اتنا پُرانا ہے کہ کہ آج تک کوئی اس کے زمانہ تعمیر کا یقین نہیں کر سکا اس گرجا کے نیچے تہ خانہ ہے۔ ہم لوگ اس میں آسیب کا خیال کرتے ہیں۔ یہ تہ خانہ دن میں بھی سجدتار یک اور سنسان رہتا ہے اور ایسا آدمی جو رات کو اس کے قریب جانے کی ہمت کر سکے اس نواح میں شاید ہی کوئی ہو۔ لیکن سربراہٹ بالکل بیخون آدمی ہیں انھوں نے اپنی تمام عمر میں کسی شے سے خوف نہیں کیا۔ لیکن وہ رات کو وہاں کیا کیا کرتے ہیں؟“

”زر اصبر کیجئے آپ نے کہا تھا کہ وہاں ایک آدمی اور بھی آتا ہے۔ وہ ضرور ملازمین یا اہل خانہ میں سے ہوگا پس آپ اس کو شناخت کر کے اس سے دریافت کیجئے۔“

— ”میں صورت آشناؤں میں سے تو وہ کوئی ہے نہیں۔“

”یہ آپ کیسے کہہ سکتے ہیں؟“

کیونکہ میں نے اسے دیکھا ہے۔ دوسری شب کا واقعہ ہے سربراہٹ واپس ہو کر میرے اور بٹلر کے قریب سے نکلے چلے گئے۔ ہم دونوں حیرت کی طرح جھاڑیوں میں چھپ گئے تھے کیونکہ چاند نکلا ہوا تھا ہننے دوسرے آدمی کو پیچھے کی طرف جاتے دیکھا اس سے ہمیں بالکل خوف نہ تھا۔ اس لئے جب سربراہٹ چلے گئے تو ہم اٹھے

اور سیدھے اس کے سامنے جا کھڑے ہوئے گویا ہم چاندنی میں چل کر رہے تھے اور اتفاق سے اسے مل گئے تھے۔ میں نے فوراً آواز دی اور نام پوچھا اس نے میں آتے ہوئے نہیں دیکھا تھا پس آواز سنتے ہی اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا اور اس کے چہرے سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ گویا اس نے دوزخ سے نکلتے ہوئے شیطان کو دیکھ لیا ہے وہ چلایا اور بھاگا وہ خوب بھاگ سکتا تھا۔ ایک منٹ میں وہ نظروں سے غائب ہو گیا اور میں یہ پتہ نہ چلا کہ وہ کون تھا۔

”لیکن آپ نے اسے چاندنی میں بخوبی دیکھا؟“
— ”ہاں میں قسم کھا کر کہہ سکتا ہوں کہ وہ زرد رنگ کا آدمی تھا اور ذلت اس کے چہرے سے عیاں تھی۔“

”ہو مز کچھ دیر تک خیال میں محو بیٹھا رہا۔“
لیڈی فالڈر کے ساتھ کون رہتا ہے؟ اس نے دریافت کیا۔
— ”ان کی ملازمہ کیری انوس ہے جو پانچ سال سے ان کے پاس ہے؟“

— اور اس میں بھی شک نہیں کہ بہت مانوس ہے؟“
— ”سٹرپسین نے ذرا گھبرا کر کہا ”ہاں وہ مانوس تو ضرور ہے مگر میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ کس سے مانوس ہے؟“
— ”اچھا؟“

— ”میں اس سے زیادہ کچھ نہیں جانتا۔“
— ”سٹرپسین میں خوب سمجھتا ہوں۔ ڈاکٹر ڈائسن نے جو تصویر سربراہٹ کی پیش کی ہے اس سے میں سمجھ سکتا ہوں کہ کوئی عورت ان کے ہاتھوں محفوظ نہیں ہے۔ ممکن ہے کہ بھائی

میں کا تراع اسی بنا پر ہوا ہو تمہارا کیا خیال ہے؟“
— ”مگر یہ معاملہ تو مدت سے طشت از بام ہے۔“

— ممکن ہے کہ لیڈی فالڈر کو پہلے سے اس کا علم نہ ہو۔ فرض کیجئے کہ انہیں یہ ابھی معلوم ہوا ہے۔ اور وہ خادمہ کو غلطہ کرنا چاہتی ہیں۔ ان کے بھائی اس کی اجازت نہیں دیتے اور وہ اپنے کمزوری قلب کے مرض اور خرابی صحت کی وجہ سے اپنی ارادے میں کامیاب نہیں ہو سکتیں اور اس وجہ سے وہ قابل نفرت خادمہ ہنوز ان کے ساتھ ہے۔ انہوں نے بولنا ترک کر دیا ہے اور غم غلط کرنے کے لئے شراب پینی شروع کر دی ہے۔ کیا یہ تمام مفروضہ باتیں معقول اور ممکنات سے نہیں ہیں؟“

— ”ہاں میں تو ٹھیک مگر صرف وہیں تک جہاں تک ان کا تعلق ہے۔ یہ صحیح ہے کہ جہاں تک ان کا تعلق ہے رات کو تہ خانے کی آمدورفت سے ان کا تعلق کیسے قائم ہو سکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس واقعہ کو ہم اس ضمن میں نہیں لاسکتے۔“

— ہرگز نہیں اور جناب اس کے علاوہ ایک اور بھی بات ہے جو اس ضمن میں نہیں آتی وہ یہ کہ آخر سربراہٹ کو مردے کی ہڈیاں کھودنے کی کیا ضرورت ہے؟
ہو مز چونک کر سیدھا ہو بیٹھا۔

— ”یہ ہمتے کل ہی معلوم کیا ہے۔ آپ کو اطلاع دینے کے بعد۔ کل سربراہٹ لندن چلے گئے تھے۔ بس میں بٹکر کے تہ خانے میں گیا۔ کوئی بات غیر معمولی نہ تھی لیکن ایک گوشہ میں آدمی کی ایک لاش تھی۔“

— ”میں خیال کرتا ہوں کہ آپ نے پوس کو اطلاع دی ہوگی۔“

ہمارا اصرار یہ نہ کرنا۔

”جناب میں نے یہ خیال کیا کہ معاملہ پوس کے لئے چنداں دھپس ثابت نہ ہوگا۔ ایک بوسیدہ نعش کی چند ہڈیوں اور کھوپڑی کے علاوہ کچھ نہ تھا۔ لاش ایک ہزار سال پرانی معلوم ہوتی تھی۔ لیکن اس سے قبل یہ نعش وہاں نہ تھی اس بات کی میں قسم کھا سکتا ہوں اور بتلے بھی۔ ہڈیاں ایک کونے میں رکھ کر تختے سے ڈھک دی گئیں تھیں لیکن پہلے وہ کونا بالکل خالی تھا۔“

— ”آپ نے ان ہڈیوں کا کیا کیا؟“

”ہم نے تو انہیں وہیں بچھڑ دیا۔“

— ”بہت ہی اچھا کیا۔ اور آپ نے کہا تھا کہ سربراہرٹ باہر گئے ہوئے ہیں۔ کیا وہ واپس آگئے؟“

”امید ہے کہ آج واپس آئیں گے۔“

— ”سربراہرٹ نے اپنی بہن کا کتا بارس کو کب دیا تھا؟“

”آج پورا ایک ہفتہ ہوا وہ مکان کے باہر کھڑا بھونک رہا تھا اور اس روز سربراہرٹ غصے میں تھے۔ انہوں نے پکڑ کر ملازم کو دیدیا اور حکم دیا کہ ”اسے بارس کو دے آؤ کیونکہ اب میں اس کی صورت نہیں دیکھنا چاہتا۔“

ہومز کچھ دیر خیالات میں غرق خاموش بیٹھا رہا اس نے اپنا پرانا پائپ سٹیک لیا تھا۔

”مستر مین میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ مجھ سے اس معاملے میں کیا چاہتے ہیں کیا آپ اس سے زیادہ تشریح نہیں کر سکتے؟“

— ”شاید اس سے کچھ اور تشریح ہو سکے۔ ہمارے جہاں نے

کہا اور یہ کہہ کر اس نے جیب سے ایک کاغذ نکالا اور احتیاط سے اسے کھول کر ہڈی کا ایک جلا ہوا ٹکڑا دکھایا۔ ہومز نے اسے بڑے غور سے ملاحظہ کیا۔

— ”یہ آپ کو کہاں سے ملی؟“

— ”لیڈی فالڈر کے کمرے کے نیچے کوٹھری میں ایک آتشدان ہر وہ مدت سے سرد تھا، لیکن سربراہرٹ نے سردی کی شکایت کی اور اسے روشن کر لیا۔ میرا لڑکا ہار دے اس کی دیکھ بھال رکھتا ہے آج صبح وہ میرے پاس اس ہڈی کو لایا جو اسے رکھ اٹھاتے وقت ملی اسے دیکھ کر وہ بہت گھبرایا۔“

— ”اور میں بھی بہت گھبراتا ہوں“ ہومز نے کہا ”ڈاکٹر واٹسن اس کی بابت تمہاری کیا رائے ہے؟“ ہڈی جل کر سیاہ ہو چکی تھی لیکن اس کی شناخت میں کوئی شبہ نہ ہو سکتا تھا۔

یہ آدمی کے گھٹنے کی ہڈی ہے، میں نے کہا۔

— ”ٹھیک ہے“ ہومز نے کہا ”تمہارا لڑکا آتشدان میں کوئلے وغیرہ کس وقت ڈالتا ہے؟“

— ”شام کو۔ اور پھر چلا آتا ہے۔“

— ”تو گویا رات کو وہاں ہر شخص آ سکتا ہے؟“

— ”ہاں۔“

— ”کیا تم باہر سے جاسکتے ہو؟“

”یا ایک دروازہ باہر سے۔ اور دوسرا وہ ہے جو رینگہ پڑا“

کے بعد لیڈی فالڈر کے کمرے کے راستے میں مل جاتا ہے۔“

— ”سربراہرٹ کل مکان پر نہ تھے؟“

— ”جی نہیں۔“

— تو یہ ڈی سربراہٹ نے نہیں بلکہ کسی اور آدمی نے جلائی؟
— ”ظاہر ہے“

— اس سرائے کا کیا نام ہے جس کا آپ نے بھی تذکرہ کیا تھا؟
— ”گرین ڈریگن“

”برک شائر کے اس حصے میں مچھلی کا شکار کیا ہے؟“

سیدھے سادے مسٹر مین کے چہرے سے ظاہر تھا کہ اسے یقین ہو چلا تھا کہ اسے اپنی زندگی میں ایک اور پاگل سے سابقہ پڑا ہے
”سنا تو ہے کہ پن چکی والی ندی میں سول اور غوث شاہ کب کے
پاغ میں جو جھیل ہے اس میں رو ہو پائے جاتے ہیں“

واٹسن اہم میں بڑے مشہور شکاری ہیں۔ واٹسن! ہونہ یہی بات
آئندہ تم گرین ڈریگن کے پتے پر خط و کتابت کر سکتے ہو۔ ہم آج شیکو
وہاں جائیں گے۔ یہ کہنا فضول ہے کہ وہاں ہم آپ سے ملنا نہیں
چاہتے لیکن پرچہ ہم تک پہنچ جائیں گے اور اگر ضرورت ہوئی تو
اس میں بھی شبہ نہیں کہ میں آپ کو تلاش کر لوں گا۔ جب ہم معاملات
کی گہرائی تک پہنچ جائیں گے تو میں آپ کو زیادہ پر وثوق رائے
دے سکوں گا“

یہ تھے وہ واقعات جن کی بنا پر میں اور ہومز می کی ایک خوشگوار شام
کی وقت ریل میں سفر کر رہے تھے اور ہماری جیب میں فرسٹ کلاس
کے ٹکٹ شاہ کب اسٹیشن کے تھے جہاں پر معمولاً نہیں بلکہ اگر کوئی
مسافر خواہش کرے تو خصوصاً اس کے واسطے گاڑی ٹھرائی جاسکتی
تھی۔ ادھر ریل کا تختہ بنسیوں۔ ٹوکریوں اور
ڈوسکی ریلوں سے بری طرح لدا ہوا تھا۔ منزل مقصود پر پہنچ کر

گاڑی میں سوار ہوئے اور تھوڑی دیر بعد پاکب پرائی وضع کی سرائے
کے مالک، جو شیا بارنس نے بڑے شوق سے ہم سے قرب و جوار کی مچھلیوں
کو تباہ کرنے کے متعلق گفتگو کی۔

شاہ کب کے باغ میں جو جھیل ہے وہاں سے کوئی رو ہوٹنے
کی بھی امید ہے یا نہیں؟ ”ہومز نے پوچھا۔ سرائے والے کا چہرہ
اور اس ہو گیا۔ ”جناب وہاں گزر نہیں ہے قبل اس کے کہ آپ جھیل میں
کوئی مچھلی پائیں آپ خود جھیل میں ہوں گے“
”یہ کیوں؟“

— ”کیا جناب نے سربراہٹ کو کوئی معمولی آدمی خیال کیا ہے
جناب وہ ان لوگوں کی تو فکر میں رہتے ہیں جو گھوڑوں کی خیر خبر
لینے آتے ہیں اگر آپ دونوں صاحب اس کے اصطبل کے قریب
پھٹکے تو وہ شیطان کی طرح آپ کے سر ہو جائیں گے اس گھوڑوڑ میں انھوں
نے لگی لپٹی تو رکھی ہی نہیں ہے“
— میں نے سنا ہے انھوں نے ڈربی کی دوڑ میں ایک گھوڑا داخل
کیا ہے؟“

جی ہاں کیا ہے اور بہت اچھا کیا ہے ہمارا تو سارا روپیہ اسی
پر لگا ہوا ہے اور سربراہٹ کا بھی۔ اور یہ تو بتائے۔ اس نے
ہمیں غور سے دیکھتے ہوئے کہا ”میں خیال کرتا ہوں کہ آپ خود
گھوڑوڑ میں حصہ نہیں لیتے ہیں؟“

نہیں ہم تو لندن کے دو آدمی ہیں جو وہاں کی ابراؤد ہوا سے
تنگ آکر برکشائر میں تبدیل آب و ہوا کی غرض سے آئے ہیں“
اس لحاظ سے تو آپ بالکل ٹھیک جگہ آئے آب و ہوا یہاں
اچھی ہے۔ لیکن سربراہٹ کی بابت میں نے آپ سے جو کچھ کہا ہے

اور غیر دلچسپ ہو“

”اچھا جو مواد ہمارے پاس جمع ہے اس کا امتحان کریں۔ بھائی نے اپنی بہن کے پاس آنا جانا ترک کر دیا ہے اس کا پیارا کتا دوسرے کو دیدیا ہے! واٹسن کیا اس سے کچھ پتہ چلتا ہے؟“

— ”سوائے بھائی کے غصے کے اور کیا معلوم ہو سکتا ہے؟“
 ”ممکن ہے ایسا ہی ہو۔ یا ممکن ہے کہ — غیر ایک دوسری صورت بھی ہے۔ اچھا صورت حالات پر ابتدائے مخلصیت سے اگر کوئی مخلصیت ہے۔ نظر ڈالنی چاہئے۔ لیڈی فارلڈراپنے کمرے میں رہتی ہیں، اپنا طریق عمل تبدیل کر دیا ہے سوائے اس کے کہ جب وہ اپنی گاڑی میں بیٹھ کر ٹھٹھنے جائیں انکو کوئی نہیں دیکھتا وہ صطیل پر اپنے عزیز گھوڑوں کو دیکھنے کے لئے بھی نہیں رکتیں۔ اور ظاہر ہے کہ شراب پیتی ہیں یہی ہے نہ سارے معاملے کی کیفیت“
 — ”سوائے نہ خانے والے معاملے کے“

”وہ غلط بات ہے۔ دو پہلو ہیں اور میں تم سے درخواست کروں گا کہ دونوں کو آپس میں نہ ملاؤ پہلے سلسلہ خیالات جو جسکا تعلق لیڈی فارلڈر سے بظاہر آثار اچھے نہیں معلوم ہوتے“
 ”میری سمجھ میں تو کچھ آتا نہیں“

”اچھا اب سلسلہ دوم کو لیجئے جس کا تعلق سر رابرٹ سے ہے ڈربی کی دوڑ جیتنے کا شوق جنون کی حد تک پہنچ گیا ہے۔ وہ ہمارے جنوں کے بھندوں میں گرفتار ہیں اور ان کے ہاتھوں غیر محفوظ۔ وہ چاہیں تو اس وقت قرتی کر اگر ان کے صطیل پر قابض ہو جائیں۔ وہ بہت نڈر اور میاں آدمی ہیں۔ ان کی گزر اوقا کا سہارا انکی بہن پر

اس کا خیال رکھئے گا۔ وہ اس قسم کے آدمی ہیں جو ہاتھ پہلے چھوڑتے ہیں اور سوال بعد میں کرتے ہیں۔ باغ سے تو آپ بچے ہی رہیں“

— ”مسٹر بارلس اگر واقعی یہ بات ہے تو ہم ضرور اس کا خیال رکھیں گے۔ اوہو! یہ کتنا جو ابھی ہال میں غرار ہاتھ بہت خوبصورت ہے۔“
 — ”یقیناً وہ شاسکب کی اصلی نسل کا کتا ہے۔ انگلستان بھر میں اس سے اچھا کتا نہیں ہے۔“

میں خود بھی کتوں سے شوق رکھتا ہوں“ ہومز نے کہا ”اگر آپکو ناگوار نہ ہو تو یہ کتا مجھے دیدیجئے اور جو قیمت مناسب ہوئے لیجئے“
 قیمت تو اس کی اتنی ہے کہ میں خود دے نہیں سکا۔ یہ تو مجھے سر رابرٹ نے عنایت کیا تھا۔ اسی وجہ سے میں اُسے بندھا رکھتا ہوں اگر اسکو کھول دوں تو منٹوں میں وہیں پہنچے“

”واٹسن ہمیں کھوج ملتا جا رہا ہے“ ہومز نے سرالے والے کے جانے پر کہا ”یہ تمام کھیل تھیں ہیں لیکن دو ایک روز میں ہمیں معلوم ہو جائیگا کہ کیا طریق عمل اختیار کرنا چاہئے۔ میں نے سنا ہے کہ سر رابرٹ ہنوز لندن میں ہے اس صورت میں ہم آج بلا خوف جان ان کے مالک مقبوضہ میں داخل ہو سکتے ہیں۔ دو چار باتیں ایسی ہیں جن کے بارے میں مزید تصدیق کرنا چاہتا ہوں“

”ہومز کیا تم نے کوئی نظریہ قائم کر لیا ہے؟“
 ”واٹسن صرف یہ کہ پچھلے ہفتے میں کوئی واقعہ ہوا ہے جسے شاسکب کے باشندوں کی زندگی پر گہرا اثر ڈالا ہے وہ کیا واقعہ ہے اس کی بابت ہم صرف ان نتائج سے خیال کر سکتے ہیں جو ردنامہ پر ہیں اور وہ نتائج کچھ عجیب طرح پر الجھے ہوئے ہیں۔ یہ الجھاؤ ہماری مدد کریگا۔ صرف وہی تفتیش ناکام رہتی ہے جو معمولی، سادی

اور انکی بہن کی خادمہ ان کے ہاتھ میں ہے۔ یہاں تک تو ہم
بالکل مطمئن ہیں نہ؟

— ”یہ سن تہ خانہ؟“

”ہاں تہ خانہ۔ فرض کیجئے۔ یہ یہودہ قیاس صرف ضرورتاً
ہے۔ کہ سررا برٹ نے اپنی بہن کو ہلاک کر دیا ہے“
”ہومز یہ تو بہت بعید از قیاس بات ہے“

”ہاں بہت بعید کیونکہ سررا برٹ ایک شریف خانہ ان کے
رکن ہیں لیکن اہیل کبوتر کے غول میں کبھی کبھی خنکی بھی آلتا ہے
مگر ہم اسی فرض کردہ دعوے کی بنا پر اپنی بحث قائم کریں تو ظاہر
ہے کہ سررا برٹ اس ملک سے اس وقت تک نہیں بھاگ سکتے
جب تک کہ ان کی قسمت پٹا نہ کھا جائے اور ان کی قسمت اس وقت
پٹا کھا سکتی ہے جب ان کا گھوڑا سا سکہ پر نس جیت جائے
اس لئے ان کو رہنا ہمیں رہنا لازم ہے۔ پس یہ ضروری ہے کہ
وہ اپنے شکار کی نیش کو پوشیدہ کرنے کا انتظام کریں اور
کسی ایسی ہتھی کو تلاش کریں جو لیڈی فالڈر کے روپ میں ہر
خادمہ کے ہمراز ہوتے ہوئے یہ بات مشکل نہیں رہی نیش سو وہ
تہ خانہ میں جہاں شاذ و نادر ہی کوئی آجاتا ہے لہجہ کر پوشیدہ
کی جاسکتی ہے اور وقتاً فوقتاً آتش ان میں سپرد آتش کی جاسکتی ہے
ایسی نشانیاں جیسی کہ ایک اسوقت ہمارے پاس ہے اسی صورت
میں باقی رہ سکتی ہیں۔ تمھاری کیا رائے ہے؟“

— ”یہ تمام ممکنات میں سے ہیں اگر ابتدائی مہیب قیاس کو
مان لیا جائے“

میرا خیال ہے کہ اس معاملے پر مزید روشنی ڈالنے کے لئے کل

ہمیں ایک معمولی سا تجربہ کرنا ہوگا۔ فی الحال اگر ہمیں اپنا یہ
قریب قائم رکھنا ہے تو میرے خیال میں سراسر اے کو بلا کر اس
شکاریوں کی طرح سول اور رد ہو چھلیوں کے بارے میں واقفیت
گفتگو کرنی چاہئے۔ یہی اسکو دوست بنا لینے کا سیدھا سادہ ذریعہ
ہے۔ اور ممکن ہے کہ دوران گفتگو میں اس نواح کے متعلق کوئی
مفید بات معلوم ہو جائے“

صبح اٹھ کر ہومز نے یہ بہانہ تراشا کہ ہم غلطی سے مچھلیوں کے
داسطے چارہ بھول آئے ہیں اس لئے آج شکار نامکن ہے۔
گیارہ بجے کے قریب ہم سرائے سے چلے اور ہومز نے کتے کو اپنے ہمراہ
لے چلنے کی اجازت لے لی

اُس نے ایک عالیشان باغ کے دو بلند دروازوں کے قریب
پہنچ کر کہا ”یہ وہ مقام ہے جہاں سے ددہر کے قریب لیڈی فالڈر
کی گاڑی میں سوار ہو کر نکلتی ہیں جب وہ باہر آجائے اور قبل
اس کے کہ تیزی سے روانہ ہو تم گاڑیاں سے کوئی سوال کر کے
اسے روک لینا۔ میں اس جھاڑی کے پیچھے بیٹھ کر دیکھوں گا کہ
کیا ہوتا ہے“

ہمیں دیر تک انتظار نہ کرنا پڑا۔ پندرہ منٹ کے اندر ہی اندر
ایک عمدہ زرنگ کی گاڑی آتی ہوئی نظر پڑی جس میں دو خوبصورت
مشکی گھوڑے جتے ہوئے تھے۔ ہومز نے اپنے کتے کے جھاڑی میں
پیچھے چھپا رہا اور میں نہایت سادگی سے ہلاتا ہوا سڑک پر کھڑا
رہا۔ ایک ملازم دوڑتا ہوا آیا اور دروازہ کو کھولا

گاڑی بہت آہستہ آہستہ چل رہی تھی اور میں نے یہ آسانی

اسیں بیٹھنے والوں کو دیکھا گدی پر یا میں طرف ایک گوری چٹی ،
 بھورے بال والی شوخ چٹم عورت بیٹھی تھی اور اس کے دائیں
 جانب کوئی اور کمر جھکائے شال سے سر اور شانے ڈھکے بیٹھا تھا۔
 جو بظاہر مریض معلوم ہوتا تھا۔ جب گھوڑے شائع عام پر آگئے تو
 تو میں نے کافی مرعوب کن طریقے سے اپنا ہاتھ اٹھایا۔ کوچوان نے
 باگ کھینچی تو میں نے اسے پوچھا کہ ”سرراہٹ شامکب میں ہیں یا نہیں“
 ٹھیک اسی وقت ہومز جھاڑی سے نکلا اور کتے کی زنجیر کھول دی وہ
 خوش ہو کر غراتا دم ہلاتا ہوا گاڑی کی طرف دوڑا اور پاندان پر چڑھ گیا
 دوسرے لمحے میں اس کی خوشی غصے سے بدل گئی اور گاڑی میں بیٹھنے
 والوں کی طرف بھونکتا ہوا جھپٹا۔

— ”گاڑی ہانکو۔ گاڑی ہانکو!“ ایک کرخت آواز نے کہا۔ کوچوان نے
 گھوڑوں کے ایک ہنٹر رسید کیا اور ہم سڑک پر کھڑے رہ گئے۔
 ”دائسن اب سب کچھ ہو گیا۔“ ہومز نے پر غضب کتے کے گلے میں
 زنجیر باندھتے ہوئے کہا۔ اس نے خیال کیا تھا کہ وہ اسکی مالکہ تھی
 لیکن اس نے دیکھا کہ وہ کوئی اجنبی ہے۔ کتے ایسے معاملات میں غلطی
 نہیں کیا کرتے۔“

• ”مگر وہ ایک آدمی کی آواز تھی!“ میں نے کہا۔

”ہاں دائسن ہمیں ایک اور راز معلوم ہو گیا ہے۔ تاہم بڑی
 احتیاط کی ضرورت ہے۔“

میرے دوست کو غالباً اس دن اور کچھ نکرنا تھا۔ پن چکی والی
 ندی میں اپنی ڈوروں اور بنسیوں کو ڈالاجس کا نتیجہ یہ ہوا کہ شام کے
 کھانے پر پھیلیوں کی بھی ایک قاب تھی۔ کھانیکے بعد ہومز نے پھر
 میدان عمل میں سرگرمی ظاہر کی۔ ہم پھر اسی صبح والی سڑک پر گامزن

ہوے باغ کے دروازے کے قریب ایک بلند بالا آدمی کوٹ میں
 پٹا ہوا ہمارا منتظر تھا جو قریب پہونچنے پر ہمارا لندن والا ہما
 مسٹر جان مین دار دغہ اصرطبل ثابت ہوا۔ معمولی رسم ملاقات
 کے بعد اس نے کہا کہ مجھے آپ کا رقعہ مل گیا تھا۔ سرراہٹ ابھی
 تک واپس نہیں آئے ہیں لیکن سنا ہے کہ آج رات کو واپس آئیں گے۔
 — ”تہ خانہ مکان سے کتنی دور ہے؟“ ہومز نے پوچھا
 — ”قریب دو فرلانگ ہے۔“

— ”تو ہمیں سرراہٹ کی طرف سے خوف نہ کرنا چاہئے۔“

— ”مجھ سے تو یہ نہیں ہو سکتا۔ آتے ہی وہ مجھ سے ملنا چاہیں گے۔
 تاکہ پرنس کی بابت معلوم کریں۔“

— ”اچھا۔ لیکن اگر ایسا ہے تو ہم بلا آپ کے کام کریں گے۔ آپ ہمیں
 صرف تہ خانہ بتا کر واپس آجائے گا۔“

چاند آسمان پر نہ تھا اور سجد تاریکی تھی لیکن مسٹر مین ہم کو گھاس
 سے ڈھکے ہوئے راستوں سے گئے تا آنکہ ایک تاریک تودہ ہمارے
 سامنے آیا جو پرا ناگر جا تھا ہم اس ٹوٹے ہوئے حصے میں داخل ہوئے
 جو کسی زمانے میں گر جا کا برآمدہ ہو گا اور ہمارے رہنما منہدم
 عمارت کے ڈھیروں میں سے گوتے پڑتے ہمیں گر جا کے ایک گوشہ
 کی طرف لے گئے جہاں ایک زینہ تہ خانے میں اترنا تھا۔ دیا سلائی
 جلا کر انھوں نے اس سنسان جگہ کو روشن کیا جو نہایت منحوس اور
 ہتھر کی پُرانی دیواروں میں رہیہ لگ جانے کی وجہ سے بدبودار تھی
 ہتھر اور سیسے کے تابوتوں کے انبار چھت تک لگے ہوئے تھے جو
 تاریکی میں ہمیں نظر نہ آتے تھے۔ ہومز نے اپنی لائٹیں روشن کر لی

جیسے زردی مائل روشنی کی ایک تیز شعلہ اس المناک منظر پر پڑی تھی اس کی کرنیں تابوتوں کے ان مجلا کتبوں پر سے منعکس ہو رہی تھیں جنہر اس مغز خاندان کے مخفوس نشانات کندہ تھے

”سٹر میں آپ نے ہڈیوں کا تذکرہ کیا تھا۔ کیا آپ جانے سے پہلے مجھے انھیں دکھا سکتے ہیں؟“

”وہ اس کو نے میں ہیں“ وارد غہ صہیل آگے بڑھا اور پھر خاموش تعجب میں کھڑا دیکھا جب ہماری روشنی اس طرف پڑی اور اس نے کہا ”وہ تو غائب ہو گئیں!“

”یہ میرا بھی خیال تھا“ ہومز نے مسکرا کر کہا ”میں خیال کرتا ہوں کہ انکی راکھ اب بھی اس آتشداں میں مل سکتی ہے جس میں کہ ان کا ایک حصہ قطعاً ضائع ہو چکا ہے“

مگر کسی کو کیا غرض پڑی تھی کہ کسی ایسے آدمی کی ہڈیاں جلاتا جو ہزار ہا سال پہلے مر چکا ہے؟ سٹر میں نے پوچھا

یہی معلوم کرنے تو ہم یہاں آئے ہیں“ ہومز نے کہا ”مکن ہے تفتیش طول پکڑ جائے اور ہم آپ کو یہاں روک کر تکلیف دینا نہیں چاہتے میں خیال کرتا ہوں کہ ہم اس گتھی کو صبح سے پہلے سلجھا لینگے“

جب جان میں نہیں تنہا چھوڑ کر چلے گئے تو ہومز نے کام شروع کیا پہلے قبروں کا بغور معائنہ کیا سب سے پرانی قبر سے شروع کر کے وہ سروریم اور سرڈینس کی قبر تک آگیا جو اٹھارویں صدی میں مرے تھے ایک گھنٹہ یا اس سے بھی کچھ زیادہ گزر چکا تھا قبل اسکے کہ ہومز

تلاش کرتے کرتے ایک سیسے کے تابوت تک پہنچا جو تہ خانے کے دروازے کے قریب قائم تھا میں نے اسکی اطمینان بخش چیخ سنی اسکی پھرتی سے مجھے یقین ہو گیا کہ وہ ایک نتیجے اور مقصد پر پہنچ گیا ہے۔

وہ اپنے آتش شیشہ سے وزنی ڈھکنے کے کناروں کو ملاحظہ کر رہا تھا پھر اس نے جیب سے لوہے کی ایک دھاردار سلاخ نکالی اور ایک

درار میں اسے ڈال کر پورا ڈھکنا جو صرف دو قبضوں سے جڑا ہوا تھا اُپر اٹھا دیا جب وہ اُپر اٹھا تو رگڑ کی وجہ سے بڑی کرخت آواز پیدا ہوئی۔ ڈھکنا پورا کھلنے نہ پایا تھا اور تابوت کی اندرونی

اشیا پورے طور پر نظر بھی نہ آئی تھیں کہ ایک ناگہانی واقعہ پیش آیا تہ خانے کی چھت پر کوئی چل رہا تھا۔ قدموں کی تیزی اور استواری بتلا رہی تھی کہ کوئی معینہ غرض لیکر دہان آیا ہے اور

گر جا کے راستوں سے واقف ہے روشنی کی ایک شعلہ زینے میں ظاہر ہوئی اور ایک لمحہ بعد ایک آدمی محراب میں نمودار ہوا۔ وہ بڑا مہیب صورت آدمی تھا قوی الجشتہ اور تند مزاج

ایک بڑی لال ٹیبن جو وہ ہاتھ میں لئے ہوئے تھا اس کے گھنی مونچھوں سے ڈھکے ہوئے زبردست چہرے اور خشک لیں آنکھوں پر چمک رہی تھی۔ اسکی آنکھیں تہ خانے کے کونے کونے میں شعلہ زین

معلوم ہوتی تھیں اور آخر کار وہ میرے ساتھ تھی اور مجھے ایک ملک ملکلی کے ساتھ قائم ہو گئیں

”تم کون ہو؟“ اس نے گرج کر کہا ”اور تم میرے تہ خانے میں کیا کر رہے ہو؟“ مگر جب ہومز نے کچھ جواب نہ دیا تو وہ قدم آگے بڑھ کر اس نے وہ وزنی ڈنڈا جسے وہ ہاتھ میں لئے ہوئے تھا

اٹھایا ”تم سنتے ہو یا نہیں؟ وہ چلایا ”تم کون ہو؟ اور یہاں کیوں آئے ہو؟“ اور اس کا ڈنڈا اٹھایا میں گھوما

لیکن اس سے بچنے کے بجائے ہومز مقابلے کے لئے آگے بڑھا ”میں بھی آپ سے ایک سوال پوچھنا چاہتا ہوں“ اس نے

اپنی سخت ترین آواز میں کہا ”آخر یہ کون ہے؟ اور یہ یہاں کیا کر رہی ہے؟“

اسنے لوٹ کر تابوت کا ڈھکنا اکھاڑ ڈالا۔ لالٹین کی روشنی میں میں نے ایک جسم سر سے پیر تک چادر میں لپٹا ہوا دیکھا جس کی شکل مسخ ہو چکی تھی، ناک اور فک اسفل بری طرح نمودار تھے آنکھیں ایک زرد چہرے میں بھیا نک طور پر اوپر کو تنک رہی تھیں سر رابرٹ چلا کر لٹ کھڑاتے ہوئے پیچھے کوٹھے اور ایک سنگین تابوت کے سہارے کھڑے ہو گئے ”تم کو اسکی بابت کیونکر معلوم ہوا؟“ وہ چلائے اور پھر کسی قدر حواس بجا کر کے ”تم کو اس سے کیا سروکار؟“

— ”میرا نام شرلاک ہومز ہے“ میرے ساتھی نے جواب دیا ”شاید آپ اس نام سے واقف ہوں گے۔ بہر حال میرا اس سے وہی تعلق ہے جو ہر انسان کا ہونا چاہئے یعنی قانون کو برقرار رکھنا میرا خیال ہے کہ آپ پر بہت سی باتوں کی جو ابدی عائد ہوتی“ سر رابرٹ کچھ دیر تک گھورتے رہے۔ لیکن ہومز کی پرسکون آواز مطمئن اور مستقل مزاجی کا اثر ہو کر رہا۔

”مسٹر ہومز، خدا شاہد ہے کہ میں بری الذمہ ہوں۔ ظاہری واقعات ضرور میرے خلاف ہیں یہ میں تسلیم کرتا ہوں لیکن میں اس کے علاوہ اور کیا کر سکتا تھا؟“

”اگر ایسا ہے تو میں بہت خوش ہوں لیکن مجھے افسوس ہے کہ آپ کو یہ تمام باتیں پولس کے روبرو بیان کرنی ہوں گی“ سر رابرٹ ذرا گھبراے۔ ”اگر یہ لازمی ہے تو چارہ کیا ہے اچھا مکان چلے اور آپ خود ہی طے کر لیجئے کہ یہ معاملہ کیا ہے

پندرہ منٹ بعد ہم اس قدیم محل کے ایک کمرے میں پہنچے جو اسلحہ خانہ معلوم ہوتا تھا کیونکہ بند دقوں کی بجائے نالیں شیشے کی الماریوں سے نظر آتی تھیں۔ سر رابرٹ چند منٹ کے لئے ہمیں وہاں چھوڑ کر چلے گئے جب وہ واپس آئے تو دو آدمی ان کے ساتھ تھے۔ ایک تو وہی گوری چٹی جوان عورت تھی جسکو ہم نے گاڑی میں دیکھا تھا دوسرا ایک آدمی تھا جسکے زرد چہرے سے عیاری اور بزدلی عیاں تھی۔ ان دونوں کے بشرے سے اتھانی حیرت انگیزی تھی جس سے ظاہر تھا کہ سر رابرٹ کو ان سے یہ بیان کرنے کا کہ واقعات کی رفتار کیا سے کیا ہو گئی تھی کافی وقت نہ ملا تھا۔

”دیکھئے سر رابرٹ نے ہاتھ سے اشارہ کر کے کہا ”مسٹر نالٹیٹ اور ان کی زوجہ ہیں مسز نالٹیٹ چند سال سے میری بہن کی خادمہ تھیں۔ میں ان دونوں کو یہاں اس وجہ سے لایا ہوں کیونکہ میں محسوس کرتا ہوں کہ اب دنیا میں میرے لئے بہترین چارہ کار یہی ہے کہ میں اصلی واقعات آپ سے بیان کر دوں اور میرے بیان کی تائید کرنے والے دنیا بھر میں ہی دو شخص ہیں“ ”سر رابرٹ یہ آپ کیا کر رہے ہیں؟ کیا آپ نے غور کر لیا ہے کیا یہ ضروری ہے؟ عورت نے چلا کر کہا۔

”اور میری بابت تو یہ ہے کہ میں تمام ذمہ داری سے انکار کرتا ہوں“ اس کے شوہر نے کہا۔

سر رابرٹ نے اُس پر ایک حقارت آمیز نگاہ ڈالی۔ ”ساری ذمہ داری میں اپنے آپ پر لیلونگا۔ انھوں نے کہا۔ ”مسٹر ہومز آپ واقعات کا سیدھا سچا بیان سن لیجئے“

آپ واقعات کی تہ تک پہنچ چکے ہیں دہن میں آپ کو وہاں نہ پاتا جاں دیکھ رہا ہوں۔ اس لئے میرا یہ خیال ہے کہ آپ کو معلوم ہو گا کہ میں ڈربنی کی دوڑ میں ایک گھوڑا دوڑا رہا ہوں اور ہر بات کا انحصار اس کے جیتنے پر ہے اگر میں جیت گیا تو تمام مشکلات آسان ہو جائیں گے اور اگر ہار گیا تو — نتائج کا خیال کرتے میری روح کا پتہ ہے۔

”میں آپ کی حالت کو سمجھتا ہوں“ ہومز نے کہا۔

”میں ہر چیز کے لئے اپنی بہن لیڈی فالڈر کا دست گم ہوں لیکن یہ بات اچھی طرح معلوم ہے کہ انکی جائداد پر انکا قبضہ تاحیر حیات ہے اور میں بری طرح مہاجنوں کے قبضے میں ہوں میں ہمیشہ سے چاہتا ہوں کہ اگر میری بہن مرجائیں تو قرضخواہ چیل کوڈں کی بج بچھڑوٹ پڑیں گے اور ہر چیز پر میرے صطیل پر میرے گھوڑوں پر قابض ہو جائیں گے۔

”سٹر ہومز اب سنئے کہ میری بہن ایک ہفتہ ہوا در حقیقت مر گئی ہیں“

”اور آپ نے کسی سے نہیں کہا؟“

سٹر ہومز میں کیا کر سکتا تھا۔ تباہی کا سامنا تھا۔ اگر وہ تین ہفتے کے لئے معاملات کو سنبھال لوں تو کام چلے انکی خادمہ کے شوہر یعنی یہ جو میرے سامنے کھڑے ہیں ایکڑ ہیں۔ ہنر یہ سوچا میں نے سوچا۔ کہ وہ کچھ عرصے کے لئے میری بہن کے روپ میں رہ ضرورت صرف اس بات کی تھی کہ روزانہ وہ گاڑی میں نکلا کرے کیونکہ انکی خادمہ کے علاوہ کسی کو میرے کمرے میں داخل ہونے کی نہ اجازت ہے۔ در نہ ضرورت۔ ان سب باتوں کا انتظام کرنا چنداں مشکل نہ تھا۔

میری بہن مرض استسقا میں مریں جو ان کو مدت سے لاحق تھا۔

”خیر یہ تو ڈاکٹر خود طے کر لے گا“

”ان کا ڈاکٹر تصدیق کر سکتا ہے کہ کئی ماہ سے علامات اسی نتیجہ کا خوف دلاتی تھیں“

”خیر تو آپ نے کیا کیا؟“

پہلی ہی شب کو میں اور نالیٹ لاش کو اسے کوئے والے مکان میں لے گئے جو اب غیر مستعمل ہے لیکن ان کا پیارا کتا ہماری پیچھے لگ گیا اور دروازے پر جا کر چلنے لگا۔ اس لئے میں نے خیال کیا کسی اور محفوظ جگہ کی ضرورت ہوگی کتے سے چھٹکارا پا کر ہم لاش کو گر جا کے تہ خانے میں لے گئے۔ ہم نے نقش کی کسی قسم کی توہین یا تحقیر نہیں کی میں محسوس کرتا ہوں کہ میں نے مرنے والی پر کوئی ظلم نہیں کیا ”میرے خیال میں آپ کا طرز عمل ناقابل معافی ہے“ ہومز نے کہا۔

سربراہ رٹ نے بے صبری سے سر ہلا کر کہا ”پند و نصائح بہت آسان ہیں۔ لیکن اگر آپ میری جگہ ہوتے تو آپ کے خیالات مختلف ہوتے کوئی آدمی اپنی تمام تدبیروں اور امیدوں پر آخری لمحے میں اس طرح پانی پھرتے نہیں دیکھ سکتا یہ ناممکن ہے کہ وہ کوئے نہ کرے میں نے خیال کیا کہ اگر ہم نعش کو ان کے آباد اجداد میں سے کسی کے تابوت میں جو گر جائیں مدفون ہیں رکھ دیں گے تو وہ نعش کے لئے کوئی ناموزوں جگہ نہ ہوگی ہم نے ایک تابوت کھول کر اس میں سے قدیم نعش نکال لی اور لیڈی فالڈر کی نعش رکھ دی جیسا کہ آپ نے خود دیکھا۔ اور جو پرانی ہڈیاں ہم نے نکالی تھیں ان کو ہم تہ خانے کے فرش پر پڑا چھوڑ نہیں سکتے تھے۔ نالیٹ اور میں انکو وہاں سے

لے آئے اور وہ رات کو اتر کر انھیں آتش دان میں جلایا کرتے تھے یہ سارا قصہ ہے مگر آپ نے کیونکر مجھے اتنا مجبور کر دیا کہ میں اسے بیان کر رہا ہوں میری سمجھ سے باہر ہے۔ ہومز نے کچھ دیر خیال میں غرق بیٹھا رہا۔

”سر رابرٹ آپ کے قصے میں ایک خامی ہے“ آخر کار اس نے کہا ”اگر قرضخواہ آپ کی جائداد پر قبضہ کر لیتے تب بھی دود کی بابت آپ کی امیدیں اور بازیاں قائم رہ سکتی تھیں“

وہ گھوڑا بچلہ میری جائداد کے دو اور ان لوگوں کو میری بازیوں کی کیا پرواہ؟ یہ بالکل ممکن تھا کہ وہ اسے سرے سے دوڑنے ہی نہ دیتے اور میرا سب بڑا قرضخواہ بد قسمتی سے میرا سب بڑا دشمن ہے وہ بڑا بد معا ہے سام بردور اس کا نام ہے میں نے ایک مرتبہ مجبور ہو کر اس پر خوب ہنڑ چلائے تھے۔ پھر کیا آپ امید کرتے ہیں کہ وہ مجھے بچانے کی کوشش کریگا؟ خیر سر رابرٹ ”ہومز نے اٹھ کر کہا“ اس معاملے کی اطلاع پولس میں ضرور ہونی چاہئے۔ میرا فرض صرف یہ تھا کہ واقعات کا انکشان کر دوں

اور میں انکو ہمیں چھوڑتا ہوں رہا آپکا طرز عمل سو اس کے جائز یا ناجائز ہونے کی بابت رائے دینا میرا کام نہیں۔ واٹسن! اب آدھی رات کا وقت ہے اور میرا خیال ہے کہ ہم اب اپنی جائے قیام کو چلیں“

یہ بات عام طور پر معلوم ہو کہ اس عجیب واقعے کا انجام وہ نہ ہوا سر رابرٹ جس کے مستحق تھے اشاسکب پرنس ڈربی کی دوڑ جیتا اور مالک کو اسی ہزار پونڈ نقد کی آرنی ہوئی قرضخواہ دود کے ختم ہونے تک ہاتھ روکے رہے اور اس کے بعد ان کا قرض ادا ہو گیا پھر بھی سر رابرٹ کے پاس کافی روپیہ بچا اور وہ آئندہ زندگی میں خوشحال زندگی بسر کرتے رہے۔ پولس اور عدالت دونوں نے معاملے پر ترجمانہ نظر ڈالی اور ڈربی کے خوش قسمت فارج کو اطلاع وفات میں غیر معمولی تاخیر کی بنا پر عدالت نے صرف تنبیہ کر کے چھوڑ دیا اور اب اس عجیب واقعہ کے صاف بچکر انکی آئندہ زندگی تفکرات سے بری بسر ہو رہی ہے۔ (ڈائل)۔

شہاب برنی

انتخاب نایاب لکھنؤ کے جدید نادر تحفے

برنی قوام متباکو فی تولد
برنی قوام کی گویاں باسنہری فی تولد عید
زبدہ متباکو کراپیشیل فی سیر
ندردہ متباکو شکی فی سیر عذرانی فی سیر
عطر اسٹار آف انڈیا فی تولد
عطر گلستان ام فی تولد
پیری باتوں میر اسکیل فی شیشی چار او انس
عطر بہار جس کی پاکیزہ خوشبو ہوائے بہار کی طرح روح پرور اور دلورہ انگیزی فی تولد
عطر شہزادے برنی قوام یہ دی شہرہ آفاق قوام ہے جو ہندوستان بھر میں بالاقاق
لانی تسلیم کیا گیا ہے اور جس نے پان کھانے والی سیلک کو اپنا والد و شیدا بنا رکھا ہے
اگر ایک نیش نہ فرمایا ہو تو اب ایک مرتبہ ضرور نیش کیجئے فی تولد
تاج خورشیدی علی تاجر عطر و متباکو تظیر آباد لکھنؤ

اصغر علی محمد علی تاجر عطر لکھنؤ کی ہندوستان بھر میں مشہور ہے

ابن یمن کے گمشدہ نایاب دیوان کی دستیابی

حافظ کی شاعری کے متعلق ایک جدید انگلستانی

تاریخ ادب فارسی میں حیرت انگیز اضافہ

مندرجہ بالا عنوان کے ماتحت رسالہ نگار (ماہ مئی ۱۹۷۴ء) میں ایک مقالہ شائع ہوا ہے۔ مقالہ نگار صاحب نے بعض وجوہ کی بنا پر جنہیں وہ خود اچھا جانتے ہیں اپنا نام آرگس بتایا ہے۔ دنیا کے ادب کی خوش قسمتی سے آرگس صاحب کو کہیں سے ابن یمن کے نایاب دیوان کی ایک کاپی دستیاب ہو گئی ہے جس کے مطالعہ نے آپ کی طبیعت پر ایک حیرت انگیز اثر پیدا کیا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ آپ نے خواجہ حافظ کی شاعری کو صرف ابن یمن کی تقلید اور نقل کہہ دیا کاش کہ آپ اپنے خیالات کے اظہار میں ذرا میانہ روی سے کام لیتے اور اس اضافہ معلومات کی بنا پر ادبیات فارسی میں تہلکہ ڈالنے کی کوشش نہ کرتے، بات بہت معمولی تھی۔ اور معمولی طور پر کہی جاسکتی تھی۔ لیکن آپ نے قطرہ شبنم میں طوفانِ مہم پیدا کرنے کی جوشی کی ہے اس نے مجھے مجبور کیا ہے کہ آرگس صاحب کے اس بلند آہنگ دعویٰ کا جواب لکھا جائے آرگس صاحب لکھتے ہیں:-

”اگر ایک طرف یہ امر مسلم ہے کہ بزمِ نغزل میں اپنے لئے بجا طور پر مسندِ صدارت حاصل کر چکے ہیں تو دوسری طرف اس سے بھی انکار نہیں ہو سکتا کہ حافظ کی شاعری کا کوئی مخصوص رنگ نہیں ہے اگر اس وقت وہ ایک صوفی باصفا ہیں تو دوسرے وقت ایک رند لاابالی۔ اگر بھی ہوگی تسبیح و تہلیل کے نعروں سے خائفہ گونج رہی تھی تو کبھی ان کے ہوش سے سے خانہ مین ہنگامہ برپا نظر آتا ہے۔ کسی جگہ نکات تصوف بیان ہو رہے ہیں کہیں فلسفیانہ معے حل کئے جا رہے ہیں اور کہیں نہ تصوف ہے نہ حکمتانہ شریعت ہے نہ طریقت ایک اہمال ہے ناقابلِ تاویل ایک بے راہ روی ہے منزل سے کوسوں دور۔ یہ اعتراض زمانہ حال ہی میں ان پر وارد نہیں ہوا بلکہ خود ان کے زمانے میں بھی لوگوں نے اس کو محسوس کر لیا تھا۔ چنانچہ جب شاہ شجاع خواجہ حافظ سے کشیدہ خاطر ہو گیا۔ تو اس نے خواجہ حافظ کو بلا کر کہا کہ آپ کی کوئی غزل ایسی نہیں جو ہمارا ہو اور ایک رنگ پر قائم۔ ایک شعر میں صوفیانہ نکات ہیں تو دوسرے میں بوالہوسی کے جذبات۔ تیسرے میں مشائخ پر طعن و تشنیع۔ چوتھے میں فلسفہ۔ اس کا کیا سبب ہے..... اسی طرح اور لوگوں نے بھی حافظ کے اس انداز پر اعتراضات کئے ہیں اور آج بھی نقاد نگاہیں ان کی شاعری کے اس نقص کو نظر انداز نہیں کر سکتیں.....“

مجھے معلوم نہیں کہ علاوہ شاہ شجاع کے اور کن صحاب نے خواجہ صاحب کی شاعری پر یہ اعتراض وارد کیے اپنی خوش مذاقی اور سخن شناسی ثبوت

دیا ہے۔ دنیا جانتی ہے اور مقالہ نگار صاحب ہی اس سے نا آشنا نہیں کہ شاہ شجاع نے جسوقت خواجہ حافظ پر اعتراض کیا تھا اس وقت ان کے تعلقات باہم نہایت کشیدہ تھے اور نہ صرف یہ اعتراض بلکہ اور کئی ایسے ہی بے معنی اعتراض اس نے آپ کے کلام پر کئے اور وہ ہر حیلہ سے جائز ہو یا ناجائز خواجہ صاحب کو بدنام کرنا چاہتا تھا۔ اور ان کو تکلیف دینا چاہتا تھا ایسے اعتراضات کی وجہ محرک پر کچھ لکھنا میرے خیال میں چنداں مفید کار نہیں۔ دیکھنا یہ ہے کہ اعتراض کیا ہے۔ اور ان کی وقعت کیا ہے۔

میں سچ کہتا ہوں کہ جب کسی شخص کو کسی شاعر کے کلام پر میں یہ اعتراض کرتے سنتا ہوں کہ کلام ہموار نہیں ہمزگ نہیں۔ کہیں ایک خیال ہے کہیں دوسرا۔ کہیں وہ صوفی ہے کہیں رند۔ کہیں موحید ہے کہیں بت پرست۔ کہیں مست ہے اور کہیں مستور۔ کبھی مجاہد ہے کبھی حقیقت۔ کبھی تسبیح و تہلیل ہے اور کبھی ہوس رانی۔ تو مجھے معترض کی سخن ناشناسی اور اس کی ادبیات سے بیگانگی پر رحم آتا ہے اور اس کی دلیری پر غصہ۔ شاہ شجاع نے یا اس کی تقلید میں کسی اور صاحب نے جب ذوق صحیح کا جنازہ نکال کر خواجہ حافظ کی شاعری پر یہ اعتراض کیا تو کیا اسے یہ معلوم نہیں تھا کہ حافظ غزل لیں کتا ہے۔ احیاء العلوم کو منظوم نہیں کرتا۔ وہ صوفی نہیں ہے اور قصص الحکم پر حاشیہ نہیں رکھتا۔ وہ نقیب نہیں ہے اور ہدایہ کی شرح نہیں کرتا۔ وہ فلسفی نہیں ہے اور بوعلی سینا یا فارابی کے فلسفہ کی تردید یا تائید نہیں کرتا۔ وہ مفسر نہیں ہے اور کشاف کو شعروں میں منتقل نہیں کرتا۔ وہ کسی لکیر کا نقیر نہیں ہے جو چاہتا ہے کتا ہے۔ وہ پاب زنجیر نہیں ہے جدھر چاہتا ہے جاتا ہے۔ معترض آنکھیں بند کرے تو یہ اور بات ہے دگر نہ وہ دیکھ سکتا ہے کہ حافظ جو کچھ کتا ہے لوگ اسے گوش دل سے سنتے ہیں اور وہ جدھر جاتا ہے لوگ اس کی خاک راہ کو آنکھوں کا سرمہ بناتے ہیں۔ شاہ شجاع کے اعتراض کے جواب میں خواجہ صاحب نے جو کچھ کہا شاہ شجاع اسے نہ سمجھا اور نہ شاہ شجاع کی کورانہ تقلید کرنے والے اسے سمجھے۔ جواب مختصر اور دندان شکن تھا۔ آپ نے فرمایا حضرت آپ کا اعتراض سر آنکھوں پر۔ لیکن آنکھوں سے تعصب کی پٹی کھولئے اور دیکھئے کہ میری غزلوں کو دنیا کن نگاہوں سے دیکھتی ہے اور برخلاف اس کے ان لوگوں کے کلام کا کیا حشر ہوتا ہے جو آپ کو میرے شعروں پر اعتراض کرنے کی ترغیب دیتے ہیں۔

حدیچے بری اے سست نظم بر حافظ قبول خاطر و لطف سخن خدا داد است

حیران ہوں کہ یہ اعتراض خواجہ صاحب کی شاعری کے ساتھ کیوں مخصوص کیا گیا ہے۔ کسی ایسے فارسی یا اردو شاعر کے دیوان کو اٹھا کر دیکھئے جسے قبول عام نصیب ہوا ہو۔ اور فرمائیے کہ یہ اعتراض یہاں بھی اسی شدت سے وارد ہوتا ہے یا نہیں۔ آدمی ثنوی یا قصیدہ لکھنے بیٹھے تو البتہ وہ ایک خاص رنگ ایک خاص خیال اور ایک خاص مدعا کو مد نظر رکھ سکتا ہے غزل گو شاعر کو کسی ایسی پابندی سے کیا سروکار اس کی ایک غزل کو دوسری غزل کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ایک ہی غزل کے ایک شعر کو دوسرے شعر کے ساتھ کچھ واسطہ نہیں۔ یہاں ایک خیال ہے وہاں دوسرا۔ یہاں ایک رنگ ہے وہاں دوسرا۔ اور حقیقت یہ ہے کہ اسی رنگ آمیزی میں غزل گو شاعر کا کمال فن ظاہر ہوتا ہے مناظر قدرت میں رنگ آمیزی کے کرشمے دیکھئے۔ کیا تو سقزج کا حسن مختلف رنگوں کی آمیزش سے پیدا نہیں ہوتا۔ دریاؤں، پہاڑوں، جنگلوں، صحراؤں، ریگستانوں اور خیابانوں کے نظاروں کی دکائی کیا اسی اختلاف کی مرہون منت نہیں مصور کے قلم کی سحر کاریاں جو طلسم پیدا کرتی ہیں کیا وہ انہی مختلف رنگوں سے پیدا نہیں ہوتا۔ یہی کیفیت غزل کی ہے۔ کیا آپ نہیں دیکھتے کہ ہنر غزل

ہر قسم کا تیل صغریٰ محمد علی تاجر عطر لکھنؤ سے منگانا چاہئے

کا بے مثل انتخاب بندشوں کی چستی اور اشعار کی سلاست شیسوئی اور روانی جس کا ثبوت آپ کے دیوان کے ہر صفحہ سے ملتا ہے اس امر کی وجہ سے دلیل ہے کہ آپ کا مطالعہ نہایت وسیع تھا۔ اور ادبیات فارسی میں آپ کو مکافہ دسترس حاصل تھی۔ پھر معلوم نہیں کہ مقالہ نگار صاحب نے آپ کی تعلیم کو خام کیونکر سمجھ لیا میں انکی اس منطق پر بھی حیران ہوں کہ ایک بے کس یتیم بچہ کی تعلیم معمولی ہوئی ہوگی کیا دنیا کے بڑے بڑے شاعر بڑے بڑے مصنف اور ہر سر زمین کے قابل ترین افراد تمام کے تمام نوابوں اور امیروں کے بیٹے ہوئے ہیں۔ نہیں بلکہ برعکس اس کے کہ تلخ بتا رہی ہے کہ تمام وہ لوگ جو آسمان علم و ادب پر ستارے بن کر چمکتے ہیں اور جن کی ضیا افشانیوں نے روئے زمین سے جہالت کی تاریکی کو دور کیا ہے غریب والدین کے بیٹے تھے۔ الاما اشارہ اندر۔ اس لئے یہ دعویٰ کہ خواجہ صاحب نے چونکہ بے کس کی حالت میں تعلیم پائی تھی۔ اس لئے ان کی تعلیم خام رہی۔ اور ابن بین چونکہ میر ابن امیر تھے اس لئے ان کی تعلیم نہایت مکمل تھی۔ ایک ایسا دعویٰ ہے جس کی تردید اور تکذیب تمام اقوام عالم کی تاریخ سے ہو رہی ہے۔

— علاوہ ازیں خواجہ صاحب کے کلام پر جو اعتراض کیا گیا ہے وہ تعلیمی خامی کا نتیجہ نہیں ہو سکتا تعلیمی خامی کا لازمی نتیجہ کلام کی خامی ہے۔

لیکن خواجہ صاحب کے معاصرین نے جو ان کے دشمن تھے یا حاسد بھی ان کے کلام کو خام نہیں کہا۔ نہ کوئی ذی شعور آدمی ان کے کلام پر یہ اعتراض کر سکتا ہے۔

— دوسری وجہ جو مقالہ نگار صاحب نے خواجہ حافظ کی شاعرانہ کجروی کی بیان کی ہے وہ یہ ہے ”طبیعت میں ذاتی جوہر قابلیت مفقود ہونا کوئی نہیں مختلف رنگوں کا ان پر اثر ہونا ضروری تھا۔“ شاعری کے لئے جس ذاتی جوہر قابلیت کی ضرورت ہے۔ اگر خواجہ حافظ میں وہ مفقود تھا۔ تو معلوم نہیں یہ جوہر اور کس شاعر کو ودیعت ہوا تھا خواجہ صاحب کے بے استاد ہونے کے متعلق صرف اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ شعراء ملا میذا الرحمن اس لئے کہلاتے ہیں کہ فن شاعری اسکولوں یا کالجوں میں نہیں پڑھایا جاتا۔ ”ذاتی جوہر قابلیت“ کی ضرورت ہے اور اگر یہ جوہر موجود ہو تو استاد کی کوئی ضرورت نہیں ہوتی۔ بصورت دیگر کوئی استاد کسی شاگرد کو شاعر نہیں بنا سکتا اور دنیا بھر ادب کی تاریخ اس امر کی شاہد ہے۔

رہا مختلف رنگوں کا اثر۔ اس باب میں بھی زیادہ لکھنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی شاعر جتنے مختلف شعرا کا کلام سنے جتنے مختلف رنگوں کا اثر۔ اثر ہوا اتنا ہی مفید ہے مطالعہ کی وسعت کو تعلیم کا نقص نہیں کہا جاسکتا۔

آگے چل کر آگس صاحب خواجہ حافظ اور دیگر شاہسیرین پر ابن بین کی فضیلت ثابت کرتے ہوئے فرماتے ہیں :-

”..... مگر ابن بین خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہے کیونکہ وہ شخص جس نے سب سے پہلے کیفیات حقیقی

کو جذبات غیر حقیقی سے جدا کیا۔ اور حقیقت و اسرار حقیقت کو غیر معصوم جذبات کی آمیزش سے بچا با وہ

ابن بین ہے۔ انھوں نے جہاں جہاں فضائے قدس میں پروردگار کو ملے ہیں اس قدر بلند چلے گئے ہیں کہ

کسی دوسرے خیال کی رسائی نہیں ہو سکتی

ابن بین کا یہ رنگ بھی ہے کہ کبھی کبھی خانقاہ سے اٹھ کر خانہ کی طرف بھی چلے جاتے ہیں مگر یہاں بھی

صوفی قائم رہتے ہیں۔ نہ کبھی زند لا ابالی کی طرح کسی کی پگڑی اچھالتے ہیں نہ ان کا خرقہ و سجادہ کبھی رہن مے ہوتا ہے اور نہ وہ دین و دنیا کو ساقی کی نیم نگاہی پر قربان کر دیتے ہیں۔

آبن مبین کے متعلق یہ سب کچھ صحیح مسمی۔ دیکھنا یہ ہے کہ جہاں غنوی یا قطعات میں یہ رنگ کامیاب ہو سکتا ہے کیا وہاں غزل میں بھی اس رنگ کو کامیابی نصیب ہو سکتی ہے یا نہیں۔ اس سوال کا جواب خود آبن مبین کی شاعری سے مل سکتا ہے۔ آپ کے قطعات گوزیاں زرد خلائق ہوئے مقبول ہوئے اور شہرت دوام کی سند حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے لیکن آپ کی غزلیں گوشہ گمنامی سے باہر نہ آ سکیں۔ غزل و غزلیں ہے جو ممبر پر کہا جاتا ہے اور جس میں پاس ادب ضرور ہوتا ہے۔ یہ ان لا ابالی رندوں کا کلام ہے جو لوگوں کی پگڑی بھی اچھالتے ہیں مگر ان لوگوں کی جن کی دستار فضیلت کے نیچے خدا جانے کیا کیا چھپا ہوتا ہے۔ خرقہ و سجادہ کو رہن مے بھی کرتے ہیں لیکن اس خرقہ و سجادہ کو دنیا و دام تزدیر کہتی ہے وہ دین و دنیا کو ساقی کی نیم نگاہی پر قربان بھی کر دیتے ہیں لیکن اس دین و دنیا کو جس سے تمام دنیا بیزار ہوتی ہے اور اس ساقی کی نیم نگاہی پر جس کی نیم نگاہی آج بھی دنیا سب کچھ کوٹنے کے لئے تیار ہے۔

اگر آبن مبین بھی یہی کچھ کرتے اور اسی رنگ میں کرتے جس رنگ میں خواجہ صاحب نے کیا تو آج ان کا دیوان بھی دیوان حافظ کی طرح گھر گھر موجود ہوتا اور ان کی غزلیں دنیا سے اس طرح مفقود نہ ہوتیں جس طرح وہ مفقود ہوئیں۔ یہ غلط ہے کہ چونکہ ان کا دیوان کم ہو گیا اس لئے ان کی غزلیں مقبول اور مشہور نہ ہو سکیں۔ مشہور اور مقبول غزلوں کے دیوان کے کم ہو جانے سے غزلیں کم نہیں ہو سکتیں۔ آگس صاحب خود فرماتے ہیں کہ ”لوگ ان کے قطعات اور غزلوں کو بازاروں میں گاتے تھے اور سوز و سرور کی مجلسوں میں آبن مبین کی غزلیں خاص عزت و احترام کی نگاہوں سے دیکھی جاتی تھیں“ ایک اور مقام پر فرماتے ہیں کہ ”خراسان خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہے جہاں کا گوشہ گوشہ امیر مبین الدین کے مایہ ناز فرزند آبن مبین کے کمالات شاعری سے گونج رہا تھا“ پس اگر یہ سچ ہے اور صحیح ہے کہ خراسان کا گوشہ گوشہ آبن مبین کے کمالات شاعری سے گونج رہا تھا اور ان کی غزلیں بازاروں میں اور ہر بزم طرب میں گائی جاتی تھیں۔ تو پھر یہ کیوں ممکن تھا کہ ان کے دیوان کے ایک نسخے کے کم ہو جانے سے ان کی تمام تر غزلیات روئے زمین سے کم ہو جاتیں۔ پھر اس پر طرہ یہ ہے کہ آبن مبین کے دیوان کی دستیابی اس امر کی کافی دلیل ہے کہ دنیا میں دیوان آبن مبین کا صرف ہی ایک نسخہ تھا جو آبن مبین کا اپنا تھا اور کم ہو گیا۔ بلکہ اور نسخے بھی موجود تھے جن میں سے بعض کو متقدمین نے بھی دیکھا اور جن میں سے ایک کو آج آگس صاحب نے خود بھی دیکھا ہے۔

با این ہمہ آبن مبین کے قطعات کے نسخے تو دنیا میں موجود ہیں ہر ایک تذکرہ میں ان میں سے بعض نقل بھی ہوئے اور کتابی صورت میں طبع بھی ہوئے۔ لیکن دیوان غزلیات مفقود ہی رہا اور غزلیں ایسی کم ہوئیں کہ گویا کبھی لکھی ہی نہیں گئی تھیں۔ کیا اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ یہ غزلیات اس لئے مقبول نہ ہوئیں کہ آبن مبین گو کبھی کبھی خانقاہ سے اٹھ کر مے خانہ کی طرف بھی چلے جاتے ہیں مگر وہ یہاں بھی صوفی قائم رہتے ہیں۔ ایک اور مقام پر مقالہ نگار صاحب فرماتے ہیں کہ :-

”ابن مبین نے دیوان میں صوفیانہ رنگ کے ساتھ انبساطی اور خمریاتی شاعری بھی پائی جاتی ہے۔ مگر یہ بات کس قدر عجیب ہے کہ وہ خراباقتی ہونے کے بعد بھی اپنی دلق پارسائی کی ایسی حفاظت کرتے ہیں کہ ایک چھینٹ بھی اس پر نہیں پڑ سکتی“

پھر کیا یہی دلق پارسائی کی حفاظت اور یہی پاس ادب غزلیات کے مقبول نہ ہونے کی وجہ نہیں ہے خراباقتی ہونے کے بعد بھی دلق پارسائی کی حفاظت کرنا اور اس کو چھینٹوں سے بچانا غزل گو شاعر کو کہیں کا نہیں چھوڑتا۔

آرگس صاحب یہ دعویٰ کر کے کہ حافظ کی صوفیانہ شاعری صرف ابن مبین کی تقلید اور نقل ہے اور خواجہ صاحب نے ابن مبین کے دیوان کو رد و بدل کر کے ”اپنا لیا ہے“ اپنے اس دعوے کو مضبوط کرنے کی خاطر حافظ اور ابن مبین کی ملاقات ثابت کرنا چاہتے ہیں اور اس پر تاریخی شہادت پیش کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ:-

”حافظ کی ابتدائی زندگی نہایت آزادی سیر و سیاحت اور زندگی میں گزری اور وہ مدتوں ادھر ادھر پھرا کئے۔ چنانچہ ان کے دیوان کے دیباچہ میں لکھا ہے کہ وہ مدتے مجدد اقلیم خراسان و ترکستان و ہندوستان رسیدہ“ تذکرہ نویسوں نے اس بحث سے بالکل قطع نظر کر لی ہے۔ کہ خراسان کب گئے۔ کیوں گئے اور وہاں کی شاعری کا رنگ کیا تھا..... ہمارے پاس اس بات کی شہادت میں کہ حافظ خراسا گئے وہ الفاظ کافی ہیں جو ان کے دیوان کے دیباچہ میں موجود ہیں اور جن کو ہم ابھی نقل کر چکے ہیں اب رہا یہ امر کہ وہ خراساں پو پہنچ کر ابن مبین سے ملے یا نہیں۔ سو اس کے لئے خود ابن مبین کی شہادت سے زیادہ معتبر گواہی کس کی ہو سکتی ہے۔ چنانچہ وہ لکھتا ہے۔

چغم از طعنه اغیار ترا ابن مبین کہ چوں حافظ بجاں یار و نگارے داری

اس شعر سے نہ صرف اس بات پر قطعی استدلال کیا جاسکتا ہے کہ ابن مبین حافظ سے ملے بلکہ اس سے ان تعلقات محبت و الفت پر بھی کافی روشنی پڑتی ہے جن کی بنا پر انھوں نے حافظ کو یار و نگار لکھا ہے۔ یعنی نہ صرف حافظ کی محبوبیت اور ابن مبین کی دلدادگی اس سے ثابت ہوتی ہے بلکہ یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ آپس کی یہ محبت کافی بدنام ہو چکی تھی“

معلوم نہیں آرگس صاحب نے کن آنکھوں سے دیوان حافظ کے دیباچہ کو دیکھا اور وہاں سے مذکورہ بالا عبارت نقل کی جس کی بنیاد پر ایک بے بنیاد اور بے سرو پا افسانہ مرتب کر لیا۔ اگر وہ معمولی انسانی دو آنکھوں سے دیباچہ کو ملاحظہ فرماتے تو وہ کبھی اس خطرناک غلطی میں نہ پڑتے نہ وہ ان تذکرہ نویسوں کا گلہ کرتے جنھوں نے اس بحث سے بالکل قطع نظر کر لی ہے۔ دیباچہ کی اصل عبارت اس طرح ہے۔

..... بنا بریں غزل لہلہ جہانگیرش بادنی دتے مجدد اقلیم خراسان و ترکستان و ہندوستان

عمدہ عطر کہاں فروخت ہے صفر علی محمد علی تاجر عطر لکھنؤ سے ہر قسم کا عطر منگائیے۔

رسیدہ و توافل سخن ہائے دلپزیرش در اقل زماں باطراف و اکناف عراقین و آذربایجان سرکشیدہ»

دیباچہ نگار کہتا ہے کہ خواجہ حافظ کے کلام کو وہ عالم گیر شہرت نصیب ہوئی کہ تھوڑے ہی عرصہ میں آپ کی غزلیں خراسان، ترکستان، ہندوستان، عراق، عرب، اق عجم اور آذربایجان تک پہنچ گئیں۔ لیکن مقالہ نگار صاحب نے خود خواجہ صاحب کو اٹھا کر ان تمام اقالیم کی سیر کر ڈالی۔ نتائج مشاہدہ ہے کہ خواجہ حافظ کبھی ایران سے باہر نہیں نکلے اور گو مندرجہ بالا تمام ممالک سے ان کو طلبی کے فرمان شاہی درباروں سے پہنچتے رہے لیکن اس گنج عافیت کے درویش نے کبھی باہر جانا گوارا نہ کیا۔ دیباچہ نگار کے اس مضمون کی تائید دیوان حافظ میں جا بجا موجود ہے۔ مثلاً:-
عراق و پارسی گزشتی بہ شعر خود حافظ بیا کہ نوبت بغداد و وقت تبریز است ز شعر حافظ شیرازی گویند و رقصند سیہ چشمان کشمیری و ترکمان سمرقندی
بغداد کے بادشاہ سلطان احمد بن آدیس نے کئی بار آپ کو طلب کیا آپ جانے کی آرزو تو کرتے رہے۔ لیکن گھر سے باہر قدم نہ رکھا۔ فرماتے ہیں:-

رہ نمیردیم بمقصود خود اندر رشید از خرم آن روز کہ حافظ را بغداد کند

ایک اور مقام پر فرماتے ہیں:-

شکر شکن شوند ہمہ طوطیان ہند زین قند پارسی کہ بہ بنگالہ می رود حافظ ز شوق مجلس سلطان غیاث دین غافل مشوکہ کار تو از نالہ می رود

خواجہ صاحب دکن آتے آتے رہ گئے جہاز میں سوار بھی ہوئے۔ لیکن پھر اتر پڑے اور شیراز واپس چلے گئے اسی تقریب پر کہتے ہیں:-

بس آسان مے نمود اول غم دریا ہوئے در غلط کردم کہ ہر مجلس بصد گھر نمی ارزد

افسوس ہے کہ مقالہ نگار صاحب نے دیباچہ کے پڑھنے میں زرا سی غلطی کر کے بات کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا اور پھر اس ایک شعر سے جو انھیں دیوان ابن مبین میں نظر آیا۔ کیا کیا نتائج اخذ کئے خدا جانے یہ شعر ابن مبین کا ہے بھی یا نہیں اور اگر ہے تو اس کا مطلب کیا ہے۔ آرگس صاحب خواجہ حافظ کا یہ شعر بھی دیکھ پاتے تو فوراً فرماتے کہ یہ شعر حافظ نے اس شعر کے جواب میں لکھا ہے اور طرفین سے اس دعوے کی تائید کرا لیتے۔

بس دعائے سحر ت حافظ جان خواہد بود تو کہ چوں حافظ شبخیز غلامے داری

مقالہ نگار صاحب نے دیباچہ کے مذکورہ بالا الفاظ اور دیوان ابن مبین کے ایک کی بنا پر خواجہ صاحب کی ایک مکمل سوانح عمری قیاسات کے زور پر مرتب کر لی ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں:-

”قیاس کی بنا پر یہ ہی کہا جاسکتا ہے کہ حافظ ترک نژاد تھے..... ممکن ہے کہ میرالدین

اور حافظ کے والد بہاد الدین کے تعلقات اچھے رہے ہوں..... غرض یہ کہ حافظ یقیناً اپنی ابتدائی شاعری

میں خراسان گئے اور..... اور قصبہ فریود میں پہنچے ابن مبین..... نہایت مشہور فرمان نواز تھے

حافظ ابن مبین ہاں پہونچے اور ابن مبین نے ان کی پذیرائی کی۔ پھر یہ وہاں مدتوں ایک محبوب
 ہماں کی حیثیت سے مقیم رہے یہ زمانہ ابن مبین کی شاعری کا آخری زمانہ تھا۔ وہ نکات تصوف کو
 شاعرانہ پیرایہ میں ادا کر کے داد حاصل کر چکے تھے کہ حافظ پہونچے اس لئے نتیجہ یہی ہونا تھا کہ
 کہ ابن مبین خود ان کو اپنی زندگی میں رنگ لیتے۔ یا خود حافظ ان کی نقل و پیروی کرنے لگ جاتے ہر صورت حافظ کی
 صوفیانہ شاعری ان کی ذاتی شاعری نہیں کہی جاسکتی وہ کسی صورت سے بھی ہر صرف ابن مبین کی تقلید و نقل ہے
 دیوان ابن مبین کا نہایت قدیم نسخہ میری نگاہ سے گزرا ہے اور اسی کا مطالعہ کرنے کے بعد
 مجھے اس حقیقت کا انکشاف ہوا کہ حافظ کی صوفیانہ شاعری یکسر ابن مبین کے دیوان سے ماخوذ ہے
 ابن مبین کا دیوان ان کی وفات سے چند سال پیشتر تک ہو گیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب حافظ ابن مبین کے یار و نگار
 بنے ہوئے ہر وقت ان کے ساتھ رہا کرتے تھے۔ پھر اگر اس سے یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ ممکن ہے یہ گم شدہ کلام حافظ
 کے ہاتھ لگا ہو اور اس میں رد و بدل کر کے حافظ نے ”اپنا لیا“ ہو (علی الخصوص اس وقت جب کہ ان کی غزل گوئی
 کا شہرہ اس واقعہ کے بعد ہوا ہے) تو یہ مانتا ہی پڑے گا کہ حافظ کا تصوفانہ رنگ یکسر ابن مبین سے ماخوذ
 ہے“

دیکھئے ایک چھوٹی سی غلطی سے کتنی اور خطرناک غلطیاں پیدا ہوئیں۔ اور آرگس صاحب نے ہوا میں بنیاد قائم کر کے کتنے عالی شان
 محل تیار کر لئے۔ قیاس پر قیاس کرتے چلے گئے۔ اور آخر کار خواجہ صاحب کی دیانت اور ان کی شاعری پر ایک نہایت بے باکانہ حملہ کر کے دم لیا
 اور بے الفاظ میں خواجہ صاحب پر دیوان ابن مبین کی چوری اور ابن مبین کی غزلیات کے سرکہ کا الزام لگا دیا آج کل علمی دنیا میں ریسرچ
 کا زور و شور ہے اور یہ زور و شور بسا اوقات دیوانگی کی سرحد تک جا پہونچتا ہے انہی ریسرچ والوں نے یہ بھی کہا تھا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا
 نام ہی نام ہے دنیا میں کبھی ان کا وجود نہیں ہوا۔ ان کی زندگی اور ان کے کارناموں کو کہا تھا کہ محض افسانہ ہے۔ انہی بزرگوں نے یورپ کے
 مشہور ترین ڈرامے نویس شیکسپیر کے متعلق کہا تھا کہ اس کی ہستی بھی ایک من گھڑت کہانی ہے اور یہ تمام ڈرامے اور لوگوں کے لکھے ہوئے
 ہیں۔ ابھی چند دنوں کی بات ہے کہ اسی فرقہ کے ایک حضرت نے فرمایا تھا کہ عمر خیام ایک فرضی نام ہے اور رباعیات عمر خیام مختلف شعرا کی رباعیات
 کے ایک مجموعہ کا نام ہے جن کو کسی بیاض نویس نے اکٹھا کر کے مرتب کیا اور ایک فرضی آدمی کے نام پر مشہور کر دیا آج دنیا کے ادب میں یہ حیرت
 انگیز انکشاف ہوتا ہے کہ دیوان حافظ ابن مبین کا گم شدہ دیوان ہے جسے حافظ نے رد و بدل کر کے اپنا نام مشہور کر دیا۔ کتنا ظلم ہے کتنی بے انصافی
 ہے اور کتنا بڑا بے باک اور بے بنیاد دعویٰ ہے۔ آرگس صاحب اگر انصاف کرتے مبالغہ نہ کرتے میانہ روی اختیار کرتے اور خواجہ حافظ اور ابن مبین
 کے ہم خیال اشعار بالمقابل پیش کر کے ان پر تنقید کرتے تو یہ مقالہ ایک نہایت مفید چیز ہوتی۔ لیکن انھیں ضروری معلوم ہوا کہ ایک حیرت انگیز

انکشاف کے عنوان کے نیچے حیرت انگیز باتیں ہی بیاں کی جائیں۔

آپ نے آگے چل کر خواجہ حافظ اور ابن مبین کے دیوانوں سے بالمقابل غزلیں اور شعر پیش کر کے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ بعض جگہ تو حافظ نے پوری پوری غزلیں ہی چرائی ہیں اور بعض جگہ ابن مبین کا صرف خیال لے کر اپنا یا ہے اور اسے بگاڑ کر رکھ دیا ہے۔ چنانچہ پہلے دونوں دیوانوں سے یہ دو غزلیں مثال کے طور پر پیش کی ہیں۔

حافظ

ابن مبین

ساتی بریز جبرعہ وصلت بجام ما	کمز شربت خرق تو تلخ است کام ما	ساتی بنور بادہ برافروز جام ما	مطرب بگو کہ کار جہاں شد بکلام ما
اے باد اگر بگوئے نگارم گزرنی	زہار عرصہ وہ بہ سگانش سلام ما	اے باد اگر بگلشن احباب بگیزی	زہار عرصہ وہ برجاناں پیام ما
مستم جاودان ز لب لعل کان نگار	نہا خبر یافت ز عیش مدام ما	مادر پیالہ عکس رخ یار دیدہ ایم	اے بے خبر لذت شرب مدام ما
شاید برابر ہی نکند دردم حساب	مال حلال ز اہد آب حرام ما	ترسم کہ صرفہ نہر دروز بازخواست	نان حلال شیخ ز آب حرام ما

یہ دونوں غزلیں لکھ کر مقالہ نگار صاحب فرماتے ہیں:-

”دونوں کے مطلع تقریباً ایک ہیں۔ دوسرے شعر میں کوئی فرق نہیں۔ ابن مبین کا چونکہ خاص رنگ یہ ہے کہ وہ آداب

حسن و عشق کا بہت لحاظ رکھتے ہیں اس لئے انھوں نے (بہ سگانش سلام ما) کہا مگر حافظ نے (برجاناں پیام ما)

کہہ دیا حالانکہ یہ کسی طرح اس ٹکڑے سے اچھا نہیں۔ ابن مبین نے آداب عشق کو ملحوظ رکھا ہے.....

حافظ کی شوخ مزاجی نے شعر کے مفہوم کو گرا دیا تیسرے شعر میں گو حافظ کا شعر حسیت معلوم ہوتا ہے۔ مگر

در اصل جس قدر لطیف خیال ابن مبین نے ظاہر کیا ہے وہ حافظ کے تصرف سے برباد ہو گیا.....

پیالہ میں عکس رخ یار دیکھنا ایک دور کی بات ہے۔ اگرچہ یہ مضمون بھی ابن مبین ہی کا ہے چوتھا شعر بالکل ایک

ہے ابن مبین کے یہاں مال ہے اور حافظ کے یہاں نان۔ ممکن ہے کہ کاتبوں کی تحریف سے نان کا لفظ مال

بن گیا ہو“

ان دونوں غزلوں کو دیکھ کر سخن شناس آنکھیں فوراً پچاں لیتی ہیں کہ اصل مال کس کا ہے۔ کاتبوں کی تحریف سے تو آگس صاحب آشنا

معلوم ہوتے ہیں اور مجھے یقین ہے کہ وہ کاتبوں کی اس سے بڑھ کر ستم ظریفیوں سے بھی نا آشنا نہ ہوں گے۔ کوئی پرانی کتاب نہیں جس میں

الحاقی حصے نہ ہوں کسی پرانے شاعر کے دیوان کو دیکھئے دوسرے شاعروں کی غزلیں اور شعر ضرور وہاں موجود ہوں گے جس زمانے میں طباعت

کا انتظام نہ تھا۔ لوگ مختلف بیاضوں سے مختلف مسودوں سے اور مختلف لوگوں کی زبانی سن کر دیوان مرتب کیا کرتے تھے۔ جس کا لازمی

نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ اکثر ادھر ادھر کی غزلیں اور شعر خلط ملط ہو جاتے تھے۔ موجودہ مثال میں بھی صاف صاف نظر آ رہا ہے کہ وہی خواجہ

حافظ کی غزل ہے جو سرخ ہو کر دیوان ابن مین میں درج ہو گئی۔ ایران سے خراساں پہنچتے پہنچتے درمیانی راویوں کا سلسلہ بڑھتا چلا گیا اور نتیجہ یہ ہوا کہ غزل بگڑتی چلی گئی۔ موجودہ صورت میں کسی بیاض نویس کے پاس پہنچی اور حافظ کی نہیں بلکہ ابن مین کی بیان ہوئی، اور ان کے دیوان میں درج ہو گئی۔ دونوں غزلیں غور سے دیکھئے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ابن مین کی غزل کسی شاگرد کی غزل ہے جسے کسی پختہ کار استاد کے قلم نے فرش سے عرش پر پہنچا دیا ہے۔

برعکس اس کے آرگس صاحب یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ ابن مین کی غزل کو حافظ نے اپنا دیا ہے اور بگاڑ دیا ہے آپ فرماتے ہیں کہ مطلع دونوں کا قریب قریب ایک ہے۔ حالانکہ دونوں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ ابن مین کا جرمہ وصل اور شربت فراق وہی پرانی پامال اور بے لطف ترکیبیں ہیں جسے درجہ دوم کے شاعر استعمال کرتے ہیں۔ حافظ کا مطلع اس قدر روشن اس قدر تازہ اور اس قدر پر جوش ہے کہ انسان پڑھتے ہی جھومنے لگ جاتا ہے۔ ساقی اور مطرب کو ایک ہی وقت پر سرکار لا کر خواجہ صاحب نے محفل کو اتنا گرم کر دیا ہے کہ ہوش و نمکنت الامان الامان کہنے لگ جاتے ہیں دوسرے شعر کے متعلق مقالہ نگار صاحب فرماتے ہیں کہ ابن مین نے آداب حسن و عشق کا لحاظ رکھا ہے اور حافظ نے شوخ مزاجی سے شعر کے مفہوم کو گر ادیا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اسی پاس ادب نے شعر کو خاک میں ملا دیا ہے۔ کوئے جانان کے کتوں کی پابوسی خواجہ حافظ سے تو نہ ہو سکتی تھی نہ کبھی ہوئی۔ حسن و عشق کا ماجرا بیان کرنے والا ایک غزل گو شاعر۔ پھر پاس ادب ملحوظ۔ ایسی باتیں ہیں جو خیال میں نہیں آ سکتیں۔

موسیا آداب دانان دیگر اند سوختہ جان و روانان دیگر اند

مصرع زہار عرصہ وہ بگانش سلام ما۔ کہتا تو درکنار حاقدا کتے کا نام لینا بھی گوارا نہیں کرتے۔ چنانچہ شیخ فیضی فرماتے ہیں۔

منم فیضی کہ درمیدان معنی چو من چاہک سوار تیزنگ نیست

بجلد شعر من از پوست تمامغز بجائے مردم ناپاک رگ نیست

بداں مے ماند این پاکیزہ گفتار کہ در دیوان حافظ نام سنگ نیست

موجودہ دیوان حافظ کے نسخوں میں صرف ایک جگہ لفظ سگ آیا ہے اس کے متعلق بھی مولانا آزاد بلکہ امی کہتے ہیں کہ بعض دیوانوں میں یہاں بھی یہ لفظ موجود نہیں۔

تیسرے شعر کے متعلق مقالہ نگار صاحب فرماتے ہیں کہ پیالہ میں عکس رخ یار دیکھنا ایک دور کی بات ہے اور پھر یہ مضمون بھی ابن مین ہی کا ہے۔ بہر حال دونوں شعروں کو پڑھئے اور انصاف سے کہئے کہ حافظ کا شعر کتنا بلند کتنا شوخ اور کتنا دلنشین ہے۔

آرگس صاحب فرماتے ہیں کہ یہ خیال بھی ابن مین کا ہے اور اس کی سند میں یہ شعر کہا ہے

زلالہ زار یہاں یک پیالہ چوں خدیم نمود طلعت ساقی در دن این قداح

صفر علی محمد علی تاجر عطر کہنو سے ہر قسم کا عمدہ عطر خرید کیجئے

موجب آید (ظلاً جہولاً) پوری پوری تفسیر کر دی۔ حافظ کے یہاں یہ کچھ ہی نہیں ہے۔

یہ شعر فہمی اس شعر فہمی عالم بالا سے کسی طرح کم نہیں جس کا گلہ ایک مظلوم شاعر نے کیا تھا حافظ اور ابن مین کے ان دو شعروں میں سوائے فقط (قرعہ) کے اور کوئی چیز مشترک نہیں۔ نہ ایک واقعہ کا ذکر ہے۔ نہ ایک خیال کا اظہار ہے نہ انداز بیان میں کسی قسم کی گانگت آ خواجہ حافظ نے قرآن کریم کی ایک آیت کو سامنے رکھ کر اس کے مطالب بیان کئے ہیں اور اس خوبصورتی سے بیان کئے ہیں کہ اس سے بہتر صورت خیال میں نہیں آ سکتی۔ ابن مین نے جو کچھ کہا ہے اس کا مفہوم اردو کے ان دو شعروں سے ظاہر ہوتا ہے۔

قسمت کیا ہر ایک کو قسام ازل سے جو شخص کہ جس چیز کے قابل نظر آیا

بلبل کو دیا تالہ تو پردے کو جلنا غم ہم کو دیا سب سے جو شکل نظر آیا

آرگس صاحب کو حافظ کے شعر میں سوائے نفلی ظلم کے اور کچھ نظر ہی نہیں آتا عجیب معقول اعتراض ہے کہ پہلے مصرعے سے واقعہ کے اوپر کوئی روشنی نہیں پڑتی کہ یہ کب ہوا۔ حافظ کوئی تلخی نہیں لکھ رہے تھے کہ واقعات کو مستند وار بیان کریں نہ دیوانہ پر آپ نے یہ اعتراض کیا ہے کہ دیوانہ مکلف نہیں ہوتا۔ یہ قانونی اعتراض بھی قابلِ داد ہے۔ پھر یہ فرماتے ہیں کہ جس شخص کے ذہن میں یہ آیت نہ ہو اس کے لئے اس شعر کا سمجھنا ناممکن ہے یہ تو آپ نے سچ فرمایا۔ لیکن جس شخص کا ذہن اس شعر کو پڑھ کر فوراً اس آیت کی طرف منتقل نہ ہو وہ پھر حافظ کے دیوان کو کیوں پڑھے اور اس کی گلی میں جلے کیوں آسمان۔ بار آمانت اور دیوانہ کے الفاظ سے فوراً آیت یاد نہ آجائے تو اس میں حافظ کا کیا قصور ہے کیا آپ خواجہ صاحب سے یہ توقع رکھتے تھے کہ وہ شعر میں سورۃ اور آیہ کا نمبر بھی لکھ دیتے۔ سب کا بڑھ کر ستم ظریفی یہ کہ آپ نے لفظ مسکین کو ظلاً جہولاً کی پوری تفسیر کر دیا ہے اور اس کے مقابلہ میں لفظ دیوانہ کو بے محل قرار دیا ہے معلوم نہیں کہ لفظ مسکین کو ظلم و جہول سے نہ کوئی سی نزدیک کی نسبت ہے جو لفظ دیوانہ کو نہیں۔

آرگس صاحب نے اس شعر کے علاوہ اسی مضمون پر ابن مین کے اور شعر بھی تلاش کر کے لکھے ہیں۔

مذرا دل ز عبادت کہ قضا غم زدہ ہوو قرعہ عاشق بیدل تہہ بر غم زدہ ہوو

برائے قتل پھر ایں کہ قرعہ افگندہ بند بنام ہجو من بے گناہ بے درں شد

بنام کسے حال برندی نہ بر آید این قرعہ بنام من باک تو اوں زد

اس کے بعد آپ لکھتے ہیں کہ

”اتنے شعروں کے لکھنے کے بعد یہ کہنا ایک فضول اور دور از کار بات ہے کہ یہ مضمون صرف ابن مین کے

دماغ سے نکل سکتا تھا اور حافظ نے اس کو لیا بھی تو اس صورت سے ادا نہ کر سکے جیسا کہ چاہئے تھا۔“

مجھے معلوم نہیں کہ ابن مین کے ان شعروں کا خواجہ صاحب کے اس شعر سے کیا تعلق ہے۔ اور اگر کچھ تعلق ہے بھی تو خواجہ صاحب کا

شعر ابن یسین کے شعروں سے کیوں پست ہے۔ البتہ۔ قوانین شریعت اور منطق کے قواعد کے مطابق اگر شعروں پر جرح کی جائے تو پھر شعریں باقی کچھ نہیں رہ جاتا۔

ابن یسین کے اس مضمون پر سلمان سادجی کا شعر بھی ملاحظہ ہو۔

عشق پر کشتن عشاق تفاق دل کے کرد
ادین قرعہ کہ زد بر من بدنام افتاد

اس کے بعد آرگس صاحب نے ابن یسین اور حافظ کے بعض ہم خیال شعر چن کر بالمقابل رکھ کر دکھائے ہیں۔ لیکن اس تعادل سے خواجہ صاحب کی فوقیت ثابت ہوتی ہے نہ کہ برعکس اور ہم خیال شعر تو ہر شاعر کے مقابلے میں دوسرے شاعروں کے موجود ہیں۔ اس سے تقلید یا نقل یا اخذ ثابت نہیں ہوتا۔ آرگس صاحب نے اکثر صرف ایک دو لفظوں کے مشترک ہونے سے شعر بالمقابل لکھ کر رکھ دیے ہیں۔ مثلاً:-

ابن یسین

حافظ

من از آن جن روز افزون که یوسف دامنم	کہ عشق از پردہ عصمت بھول کر زنجار	حسن زیبائے تو آندم کہ تجلی کر کرد	سرو سامان عشق تو بر ہم ہند بود
بتوش بادہ کہ ایام غم نخواہد ماند	چنان ماند و چنین نیز ہم نخواہد ماند	بتوش بادہ کہ وقت بہار گزر د	بیالہ گیر دلالہ زارے گور د
دیدم دلا کہ آخر پیری و زہد عمر	با من چہ کرد دیدہ مشوقہ یاز من	عمرے ست تاکہ حسن رخ یار دیدہ ام	حیران دوست دیدہ مشوقہ باز ما
نقشے بر آب ے زخم از گریہ حالیا	تا کہ شود قرین حقیقت مجاز ما	ابن یسین ز عشق تباں منع کو توں	چون گشتہ است عین حقیقت مجاز ما

جائے انصاف ہے کہ ان شعروں میں کوئی سی ایسی بات مشترک ہے جس کی بنا پر کہا جاسکے کہ حافظ نے ابن یسین کے خیالات لئے اور انھیں اپنا لیتے

اس کے بعد آرگس صاحب نے خواجہ صاحب اور ابن یسین کی ہم طرح غزلیں پیش کی ہیں اور کہا ہے کہ صاف معلوم ہوتا ہے کہ حافظ کے پس پردہ ابن یسین بول رہے ہیں۔ مندرجہ ذیل غزلوں کو دیکھ کر ناظرین اندازہ کر سکتے ہیں کہ یہ دعویٰ کہاں تک درست ہے:-

ابن یسین

حافظ

در خرابات مغان نور خدای بنیم	وین عجب بین کہ چہ نور نے رکجا بنیم	تا کہ من چہرہ آن ماہ تقامی بنیم	تا مسلمانم اگر جز بنیم
جلوہ بر من مفروش او ملک کحلج کہ تو	خانہ می بنی و من خانہ خدای بنیم	ہر کجائے شوم پہ تر امی شوم	ہر طرف ے نگر م روے تر امی بنیم
سوز دل اشک رو آن بھر نالہ شب	این ہمہ از اثر لطف شامی بنیم	ہیکس نیست کہ از زلف تو بوز آرد	مگر این خاصیت از باد صبا می بنیم
خواہم از زلف تباں تازہ کشائی کرد	فکر دور است ہمانا کہ خطامی بنیم	مشکل است اے دل من جاں بسلا برد	من کہ آن چشم پر از عین بلا می بنیم
کس ندید است ز شکفتن نازد چین	آنچہ من ہر بھر از باد صبا می بنیم	پرسے کہ دغش ابن یسین جان مرا	طرقہ شلہ کہ در آسان گد امی بنیم

حافظ کے تصوف اور ابن یسین کے تصوف کا مقابلہ کرتے ہوئے آرگس صاحب فرماتے ہیں کہ:-

”حافظ کا تصوف بالکل ابن مبین کا تصوف ہے اگر کوئی فرق ہے تو صرف اتنا کہ ابن مبین تصوف کو تصوف کے حدود میں رکھتے ہیں اور حافظ چونکہ وہ قدرت نہیں رکھتے اس لئے ان کے یہاں حقیقت و مجاز اور پارسی و رندی دونوں مخلوط ہو گئے ہیں۔ ابن مبین جس مسئلہ کو بیان کرتے ہیں وہ عین حقیقت کے مطابق ہوتا ہے اور شاعرانہ خصوصیت بھی ہاتھ سے نہیں جاتی۔ حافظ کہیں ان کی نقل میں کامیاب ہوتے ہیں کہیں محض لطف شاعری رہ جاتا ہے اور اصل مسئلہ میں کوئی جان باقی نہیں رہ جاتی۔ الغرض حافظ کا تصوف ابن مبین کی نقل ہے جو بعض دفع مطابق اصل ہوتی ہے اور بعض جگہ نہیں اور یہی ہونا بھی چاہئے تھا کیونکہ حافظ کو تصوف سے صرف مقالاتی نسبت تھی.....“

اس بحث پر پہلے بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اور بتایا جا چکا ہے کہ جس بات سے ابن مبین کی خواجہ صاحب پر فوقیت ظاہر کی گئی ہے وہی بات ابن مبین کی غزلیات کی ناکامیابی کا باعث ہے اور یہی حقیقت و مجاز اور رندی و پارسی کا ہم مخلوط ہونا جو حافظ کے تصوف کا نقص بیان ہوا ہے۔ حافظ کی شاعری کے لئے کیمیا کا اثر رکھتا ہے۔

ذرا آگے چل کر مقالہ نگار صاحب فرماتے ہیں کہ حافظ کی شراب دہی معمولی تلخ اور بدبو دار پانی ہے۔ برعکس اس کے ابن مبین جب اس رنگ میں کہتا ہے تو اس کی شان ہی دوسری ہوتی ہے مثال کے طور پر چند شعر بھی پیش کئے ہیں ملاحظہ ہوں۔

از دست یار سا غر و حدت کشیدہ ایم	در بزم لامکاں زمکیں و مکاں جدا
بادہ زندان مادر سا غر و بیانیہ نیست	مستی این مے پرستاں از خم و خجانیہ نیست
ز چشم مست تو عشاق موی پرست شدند	ہمہ سب کو کش بزم مے است شدند
حوئے کو شراب عشق نوشد	دو عالم را بہ یک جرعه فروشد

وغیرہ وغیرہ۔

لیکن یہ رنگ ابن مبین کے ساتھ ہی مخصوص نہیں ہے اس وقت کے اور شاعر بھی اکثر اس رنگ کے دلدادہ تھے اسی مضمون پر سلمان دجی کے چند شعر بھی دیکھئے

عجب آنکس کہ بد در لب تو مست موی است	مگر از بادہ لعل لب تو بے خبر است
سلمان رے جام است است چنین مست	تاظن نہ بری کو خم و خجانیہ خراب است
در سر ز استماع است است مستی	مارا کہ احتیاج شراب و سماع نیست
دل ز بادہ روز است رنگے یافت	منو ز بونے از ان بادہ در شام است

سپائی کا امتحان کیجئے عمدہ عطر و تیل صغریٰ علی محمد علی تاجر عطر لکھنؤ سے خرید کیجئے

دیگرہ وغیرہ۔

مگر ارباب ذوق جانتے ہیں کہ چوتھے حافظ کے معمولی تلخ اور بدبودار پانی میں ہے وہ کسی دوسری شراب میں نہیں ہے۔
مضمون کے اختتام پر آرگس صاحب فرماتے ہیں کہ ابن یمن اور حافظ کی یکجائی کا زمانہ چھ سات سال سے زیادہ نہیں ٹھہرتا حافظ
ابن یمن کے سامنے یا ان کے انتقال کے بعد شیراز پھر واپس آئے ہونگے۔ چونکہ ابن یمن موجود نہ تھے اداہی کو اسی زور و شور کے ساتھ شکر
کرتی تھی اور اب غالباً انکی کافی شہرت ہو چکی تھی لہذا انھوں نے سعدی اور خواجہ اور سلمان ساوجی کے کلام کو اپنا ہیرنیا یا اور اسی رنگ
میں کہنے لگے۔

میرزا آرگس صاحب یہ مانتے پھر گز تیار نہیں کہ حافظ نے خود اپنی طبیعت سے بھی کچھ کام لیا آپ حافظ کے سارے دیوان کو اخذ
اتباع اور نقل و سرقت کا ایک مجموعہ ہی کہہ سکتے ہیں زیادہ کچھ نہیں۔ سعدی سلمان ساوجی اور خواجہ حافظ کے متعلق تو بہت لوگ
پہلے بھی لکھ چکے ہیں اور میں بھی سان الغیب میں ان کے متعلق بہت کچھ کہہ چکا ہوں۔ لہذا اسی مضمون پر اور کچھ لکھنا تحصیل حاصل ہے ابن یمن کا
دیوان چونکہ نایاب تھا۔ اور اس دستیابی پر آرگس صاحب نے یہ حیرت انگیز انکشاف کیا ہے اس لئے ان کے اس انکشاف پر کچھ لکھنا ضروری
معلوم ہوا۔

(نوٹ) میں یہ مضمون لکھے گا تھا کہ میرے ایک فاضل سخن شناس اور ادبیات فارسی سے گہری دلچسپی رکھنے والے دوست (ام
عبداللطیف خاں صاحب سب جج ایسٹ آباد) نے فرمایا کہ میں نے ایک نسخہ دیوان ابن یمن کا پشاور میں ایک دوست کے پاس دیکھا ہے
چنانچہ انھوں نے میری درخواست پر وہ نسخہ منگوایا۔ جو آج میرے پاس ہے۔ دیوان ابن یمن کے متعلق بغیر اسے دیکھنے کے جو رائے میں نے
ظاہر کی ہے دیوان کے مطالعہ سے اس کی پوری پوری تائید اور تصدیق ہوتی ہے۔ مضمون چونکہ پورا ہو چکا ہے اس لئے ابن یمن کے متعلق
ایک مکمل اور مفصل بیان میں کسی آئندہ فرصت پر چھوڑتا ہوں

ابن یمن کے جس شعرے آرگس صاحب نے خواجہ صاحب اور ابن یمن کی ملاقات ثابت کی ہے اس کے متعلق میں اپنے شکوک
پہلے ہی ظاہر کر چکا ہوں میرے پاس جو نسخہ دیوان کا ہو چکا ہے اس میں بجائے لفظ حافظ کے لفظ خط لکھا ہے ظاہر ہے کہ یہ لفظ غلط ہے
لیکن اتنا ضرور معلوم ہوتا ہے کہ دراصل یہاں کوئی اور لفظ تھا۔ جسے کسی نے حافظ بنایا کسی نے خط اور کسی نے کچھ اور۔ کاتبوں کی تحریف ہو
جو خدا جانے بات کو کہاں سے کہاں لے گئی۔ ردیف الہت میں میں نے ایک اور شعر اسی قبیل کا دیکھا ہے

بعد ازین ابن یمن از طعمہ دشمنی پاک مثل او چوں بادشاہ غشتم داریم ما

آرگس صاحب نے طعمہ اغیار سے جو لادیز نتیجے نکالے ہیں۔ اس دوسرے شعر کے دیکھنے سے ان کی حقیقت روشن ہو جاتی ہے۔

میرولی اللہ

علم فراست الید

سمیرا رک

(گزشتہ سے پوچھتے)

اس سے قبل جو کچھ لکھا گیا ہے وہ بات کے ساخت ہتیلی کی کیفیت، ناخنوں کی حالت، مختلف اہباروں کے بیاں سے متعلق تھا اب ہم خطوط یا لکیروں کا ذکر کرتے ہیں۔ لیکن قبل اس کے کہ اصل مقصد پر آئیں، یہ معلوم کر لینا ضروری ہے کہ لکیروں کی کتنی صورتیں ہوتی ہیں اور دوسرے نشانات جو ہتیلی میں پیدا ہو جاتے ہیں وہ کیا کیا ہیں اور ان کے اصطلاحی نام کیا ہیں تاکہ آئندہ سمجھنے میں مدد ملے۔



کھنڈ سے دار لکیر



صنودی اور مہوٹلی لکیر



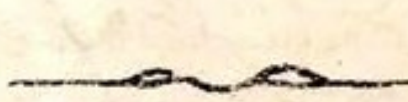
پھٹی ہوئی لکیر



دھیری لکیر



ٹوٹی ہوئی لکیر



جھیرے والی لکیر



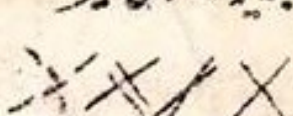
لہریاکی لکیر



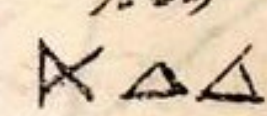
زنجیری لکیر



جال



صلیب



مثلث



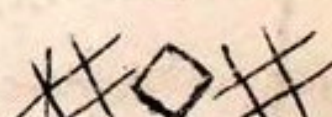
ستارہ



جڑی



دائرہ



مربع



دھبہ

بات کی خاص خاص لکیریں جن پر سب سے پہلے توجہ ہوتی ہے چھ نہیں (۱) عمر کی لکیر - (۲) دماغی لکیر - (۳) قلبی لکیر - (۴) صحت کی لکیر - (۵) قسمت کی لکیر اور (۶) شمسی لکیر۔

ذیل کے نقشے سے ہر لکیر کی جائے وقوع معلوم ہو سکتی ہے۔

ان لکیروں میں سے اہم ترین لکیر دماغی لکیر ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک شخص کی ذہنیت کیا ہے اور اس میں کس نوع کے تغیرات ہوئے ہیں جن سے اس کی زندگی پر اثر پڑا یا پڑ سکتا ہے۔

صغریٰ علی محمد علی تاجیر عطر لکھنؤ کے کارخانہ کا انتظام اب تک اس منبر کی زیر نگرانی ہے ۶ سال سے کام کر رہا ہے

اس لکیر کو دونوں ہاتھوں میں دیکھنا چاہئے بائیں ہاتھ ماری ہاتھ
کہلاتا ہے یعنی اس کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک شخص کو
درشتہ کیا خصوصیات ملے ہیں۔ داہنے ہاتھ سے اکتسابی
خصوصیات کا پتہ چلتا ہے یعنی وہ خصوصیات جسے خود نشان
نے اپنی سعی و کادوش یا ماحول کے اثر سے پیدا کیا ہے۔

دونوں ہاتھ کی لکیروں میں ادنیٰ ترین فرق کو بھی
نہایت غور سے دیکھنا چاہئے علی الخصوص یہ امر کہ لکیر کس طرف

کو گئی ہے اور کہاں ختم
ہوئی ہے کیونکہ اختتام

کی جگہ سے انسان کی ذہنیت
کا پتہ بخوبی چلتا ہے۔ مثلاً اگر

کسی شخص کے بائیں ہاتھ میں
دماغی لکیر لیچے کلائی کی طرف

چلی گئی ہے اور داہنے ہاتھ
میں سیدھی ہے یا پو بی ہتیلی کو

سیدھی عبور کر گئی ہے تو معلوم
ہوگا کہ اس شخص کو طبعی رجحان

سے ہٹ جانا پڑا ہے اور ماحول

کے اثر سے مجبور ہو کر اسے زیادہ عملی انسان بننا پڑا ہے برخلاف اس کے کہ اگر دماغی لکیر دونوں

ہاتھ میں یکساں یا قریب قریب یکساں ہوگی تو معلوم ہوگا کہ اس شخص کا ابتدائی زمانہ بغیر خلش کے گزرا ہے اور ایسے اسباب مہیا تھے
کہ اس نے اپنے فطری رجحانات کے موافق تربیت حاصل کی۔

اگر بائیں ہاتھ کی دماغی لکیر اپنے اختتام پر بھپٹ کر دو حصوں میں تقسیم ہو گئی ہو جیسے

اور ایک حصہ نیچے کی طرف مڑ گیا ہو اور دوسرا سیدھا چلا گیا ہو۔ لیکن داہنے ہاتھ میں یہ لکیر سیدھی



چلی گئی ہو تو معلوم ہو گا کہ والدین کی طرف سے اس کو دو ذوق ملے تھے خیالی اور عملی اور اس نے عملی ذوق کو پسند کر کے تجارت یا سائنس کو اختیار کیا۔ یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ مرد یا لڑکے زیادہ تر مادری خصوصیات ذہن کے حامل ہوتے ہیں اور لڑکیاں یا عورتیں پدری خصوصیات زیادہ رکھتی ہیں۔ اگر کسی مرد کے بائیں ہات میں دماغی لکیر بھٹ کر دو حصوں میں منقسم ہو گئی ہو اور اوپر کی لکیر سیدھی چلی گئی ہو تو کہا جائے گا کہ اس کی مادہ زیادہ عملی صورت رکھتی تھی۔ اگر داہنے ہات میں بھی لکیر زیادہ صاف ہو گئی ہے تو سمجھا جائے گا کہ اس میں اُن خصوصیات کی زیادہ تربیت ہوئی ہے جو مان کی طرف سے اسے حاصل ہوئی تھیں۔ عورت کے ہات میں اس کے خلاف حکم لگایا جائے گا یعنی اس میں یہی لکیریں باپ کی خصوصیات کو ظاہر کرنے والی ہوں گی۔

اگر داہنے ہات میں لکیر کا نیچے کا حصہ زیادہ روشن ہو گا تو معلوم ہو گا کہ اس نے ماں کی خصوصیات ذہنی و خیالی کی زیادہ تربیت کی ہے (اگر وہ مرد کا ہات ہے) اور اگر وہ عورت کا ہات ہے تو باپ کی طرف سے انہیں خصوصیات کا ملنا ظاہر ہو گا۔ اگر بائیں ہات میں یہ لکیر ہلکی ہو اور داہنے میں صاف و روشن ہو گا کہ والدین کی طرف سے اس کو دماغی قوت بہت کم ملی ہے اور جو کچھ اس نے حاصل کی ہے وہ صرف اسی کی محنت کا نتیجہ ہے لیکن اگر بائیں ہات میں دماغی لکیر روشن ہو اور داہنے میں ہلکی تو معلوم ہو گا کہ اس نے خود کو کوئی توجہ دماغی ترقی کی طرف نہیں کی اور اس کے والدین کی دماغی حالت اس سے بہتر تھی۔

داہنے ہات کی دماغی لکیر (خواہ وہ مرد کے ہات میں ہو یا عورت کے ہات میں) اگر ہلکی اور ناصاف ہوگی تو اس سے یہ بھی ثابت ہو گا کہ اس شخص میں کوئی حوصلہ نہیں ہے اور نہ وہ دماغی ترقی کرنے کا اہل ہے۔

اس لکیر کا صاف اور گہرا ہونا ذہنی قابلیت کی دلیل ہے، لکیر کا چوڑا ہونا یا صرف سطح پر اوپر ہی اوپر چلا جانا اچھی علامت نہیں ہے ایسی لکیر تلون کی علامت ہے۔ یہ اصول ہات کی تمام لکیروں پر حاوی ہے۔ یعنی لکیر دہی اچھی ہے جو گہری اور پتلی ہو۔

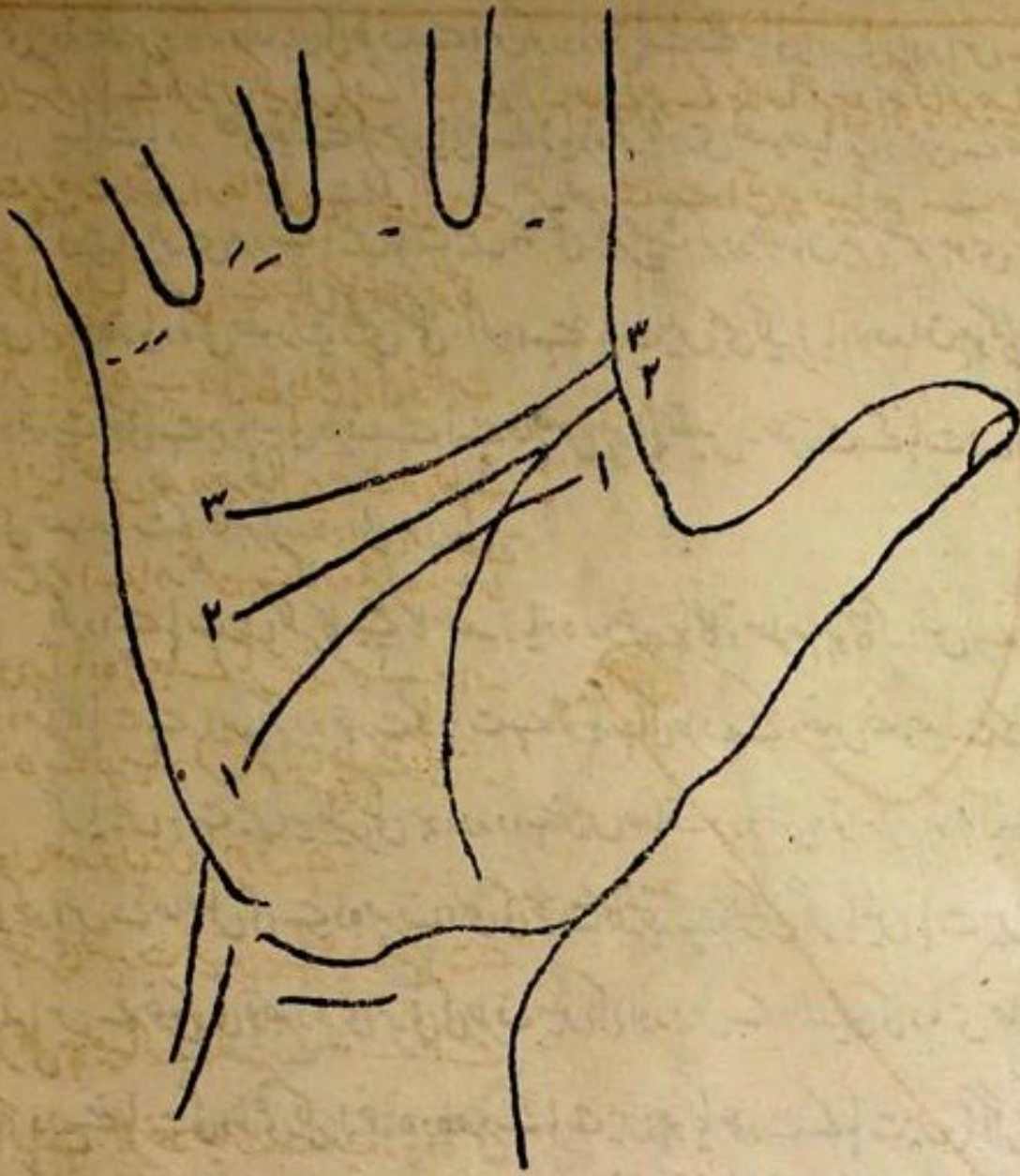
چوڑی اور بھدی لکیریں جسمانی قوت و ترقی کو ظاہر کرتی ہیں ایسی لکیریں اکثر ان لوگوں کے ہات میں پائی جاتی ہیں جو جسمانی کام زیادہ کرتے ہیں۔ دماغی کام کرنے والوں کے ہات میں تمام لکیریں اور خصوصیت کے ساتھ دماغی لکیر پتلی، گہری اور صاف ہوتی ہے۔

جس طرح دماغی لکیر کا اختتام قابل غور ہے، اسی طرح اس کا مبدأ یا مخرج بھی بہت اہم چیز ہے۔ یہ لکیر تین صورتوں سے پیدا ہوتی ہے۔ (۱) خط حیات کے اندر سے (۲) خط حیات سے ملے ہوئی یا (۳) خط حیات سے علیحدہ۔ ذیل کے نقشے سے یہ تین صورتیں واضح ہو سکتی ہیں:-

۱۔ پہلی صورت ہے ۲۔ دوسری صورت اور ۳۔ تیسری صورت۔ پہلی صورت نہایت غیر یقینی قسم کی ہے ایسی لکیر والا ضرورت سے زیادہ حساس، محتاط اور بنزدل ہوتا ہے۔ بہت زیادہ عصبی ہونا۔ معمولی بات پر بے قابو ہو جانا اس طرح کی لکیر کے خصوصیات ہیں۔ ایسے لوگ ہمیشہ اپنے پاس کے لوگوں سے لڑتے جھگڑتے رہتے ہیں اور معمولی معمولی باتوں میں الجھ جاتے ہیں۔

ہمیشہ عطر اصغر علی محمد علی تاجر عطر لکھنؤ سے خرید کرنا چاہئے

عوضہ مکان سے متاثر ہو کر برہم
رہتے ہیں اگر یہ لکیر آگے جا کر ہتیلی
میں سیدھی ہو گئی ہو اور کلائی کی طرف
زیادہ جھکی ہو تو معلوم ہوگا کہ آدمی آئندہ
کوشش سے ان تقایص پر قابو حاصل
کر سکیگا۔ اگر یہ لکیر کلائی کی طرف یا
قمر کے ابھار کی طرف چلی گئی ہے جس کا
ذکر پہلے آچکا ہے تو معلوم ہوگا کہ اس
شخص کی حالت آئندہ اور زیادہ
خراب ہو جائیگی۔ اگر یہ لکیر بد قسمتی سے
ہلکی بھی ہو یا اس میں بال کی طرح باریک
خطوط بھی دونوں طرف بکھے ہوں تو سمجھ
لینا چاہئے کہ دماغ میں خلل ہے یا اس کا



اندیشہ ہو اگر اس طرح کی لکیر کے ساتھ اور لکیر ہتیلی کی وسط کے بعد ہلکی نظر آئیں تو دماغی خرابی اور جنون پر زیادہ یقین کے ساتھ حکم لگایا جاسکتا
ہے۔ اس طرح کی لکیر زیادہ تر ان صورتوں میں پائی جاتی ہیں جب انسان فطرتاً میخواری اور ادباشی کی طرف مائل ہوتا ہے۔ اگر ایسی لکیر کے
ساتھ اور لکیر اچھی ہوں تو بھی یہ یقینی ہے کہ کبھی کبھی مسکراشیاء کا استعمال وہ ضرور کریگا۔

اگر یہ لکیر خط حیات سے ملی ہوئی ہو جیسا کہ (۲-۲) سے بتایا گیا ہے تو بھی انسان بہت حساس ہوگا۔ اور اعتماد نفس بھی آپس
دہ ہوگا۔ اگر یہ لکیر نیچے کی طرف مائل ہوگی تو احساس کی اور زیادہ شدت ظاہر ہوگی اس قسم کی لکیر نقاشوں اور صناعتوں کے ہات میں زیادہ پائی
پائی جاتی ہے۔ اگر یہ لکیر سیدھی چلی گئی ہوگی تو ضعیف پہلو کم ہو جائے گا۔ عزم و ارادہ کا ثبات ظاہر ہوگا۔ یہ لکیر جس قدر زیادہ سیدھی ہوگی
اسی قدر یہ صنعت قوی ہوتی جائے گی۔ یہ لکیر اگر سیدھی پوری ہتیلی سے عبور کرتی ہوئی مرتخ کے ابھارتک پہنچ جائے تو معلوم ہوگا کہ
اس شخص میں بہت زیادہ مضبوطی ارادہ ہے اور فرض کے انجام دہی میں وہ ہر خطرہ کو برداشت کر سکتا ہے۔

جب یہ لکیر دوہری ہو گئی ہو یعنی اس کے سرے دو حصوں میں منقسم ہو گئے ہوں اور یہ دونوں سرے برابر کے ہوں جیسا کہ ذیل کے
ہات میں ۲-۲ اور ۳-۳ کے دیکھنے سے معلوم ہو سکتی ہے، تو سمجھ لینا چاہئے کہ انسان دماغ اور خیالی و عملی قوت کے درمیان مذکورہ

زندگی بسر کر رہا ہے اگر اس لکیر میں قمر کے ابھار کی طرف جلتے ہوئے ہلکا سا خم پیدا ہو گیا ہو جیسا (۱-۱) میں ہے تو معلوم ہو گا کہ ایسے شخص کو اپنے خیالات پر بہت اقتدار حاصل ہے لیکن اگر یہ لکیر اس صورت سے واقع ہو جیسا ۴ — ۴ سے ظاہر ہوتا ہے تو پھر اس کے خلاف حکم لگایا جائے گا اور ایسا شخص اپنے خیال کا غلام ہو گا

اگر یہ لکیر ۵ — ۵ کی طرح واقع ہوگی تو ثابت

ہو گا کہ ایسا شخص حد درجہ خیال پرست اور خلوت پسند واقع ہوا ہے اور ممکن ہے کہ وہ ترک دنیا کر دے یا خودکشی پر آمادہ ہو جائے مگر ہمیشہ ۴ — ۴ اور ۵ — ۵ کے درمیان فرق کر لینا چاہئے کیونکہ ان دونوں صورتوں میں بڑا فرق ہے۔

تیسری صورت لکیر کی یہ ہے کہ خط حیات سے جدا ہو کر نکلی ہو جیسا کہ پہلے نقشہ کے ۳ — ۳ سے ظاہر کیا گیا ہے۔ اگر خط حیات سے بہت زیادہ فصل کے ساتھ نہ نکلی ہوگی تو معلوم ہو گا کہ ایسا شخص خیال میں آزاد، فیصلہ کرنے میں ذہین اور دماغی قوت کے لحاظ سے بہت جبری ہے۔ کارزار حیات میں

ایسا شخص بہت کامیاب ثابت ہوتا ہے۔ اگر یہ لکیر سیدھی تیلی سے عبور کر کے چلی گئی ہوگی تو ایسا شخص دوسروں پر اثر ڈالنے کی خاص قوت رکھے گا اور میلک زندگی میں خصوصیت کے ساتھ اس کا اظہار ہو گا۔ ایسے لوگوں کو زندگی کا ایک مقصد متعین کر لینا چاہئے ورنہ وہ ہمیشہ ادھر ادھر بھٹکتے پھریں گے

اگر یہ لکیر نیچے کی طرف زیادہ مائل ہوگی تو معلوم ہو گا کہ ایسا شخص خاص کیفیت کے ماتحت کام کر سکتا ہے ایسے لوگ اکثر بیکار زندگی بسر کر دیا کرتے ہیں۔ اگر یہ لکیر بجائے نیچے کی طرف مائل ہونے کے اوپر یعنی مریخ کے ابھار کی طرف مڑ گئی ہے تو معلوم ہو گا کہ ایسے لوگ لینڈ بننے کی اہلیت رکھتے ہیں اور میلک خدمات کے لئے ہر قربانی پر آمادہ ہو سکتے ہیں۔

اگر یہ لکیر خط حیات سے زیادہ فصل پر نکلی ہو تو سمجھ لینا چاہئے کہ ایسے شخص میں احتیاط و احساس بہت کم ہے (دیکھو ۴ — ۴) اگر یہ فصل اور زیادہ ہو تو طبیعت کی تندہی و تیزی ظاہر ہوگی، لیکن ایسا شخص کسی خاص مدعا پر قائم نہ رہ سکیگا اور جلد جلد اپنی

تدابیر میں تبدیلی پیدا کریگا۔

اگر دماغی لکیریں ”جزیرے“ پائے جائیں یا ٹوٹی ہوئی چوڑی قسم کی ہو یا بال کی طرح نازک خطوط اس سے نکلے ہوں تو معلوم ہو جائیگا یہ شخص مجنوں ہو جانے کا اہل ہے۔ بہترین دماغی لکیر وہ ہے جو خط حیات سے جدا، مشتری کے ابھار سے شروع ہو۔

دماغی لکیریں جزیروں کا پایا جانا، اچھی علامت نہیں ہے اور دماغی لکیر پر کیا موقوف ہے یہ جس لکیر میں بھی پائے جائیں گے اس کے اثرات و نتائج خراب و ضعیف ہو جائیں گے۔ اگر دماغی لکیر میں یہ جزائر زنجیر کی صورت میں اس طرح

پائے جائیں تو ان سے دماغی کمزوری ظاہر ہوگی۔ جو نتیجہ ہوگی کسی ایسی بیماری کا جس کا تعلق دماغ سے ہے اگر اس کے ساتھ یہ لکیر بہت اونچی ہوگی تو ایسے شخص کا کبھی کبھی نصف پاگل ہو جانا یقینی ہے اور اگر قمر کے ابھار کی طرف بہت زیادہ مائل ہوگی تو کبھی کبھی مایہ نعلو یا کے دورے ایسے آدمی کو ضرور پڑتے ہوں گے

جزیروں کے متعلق ایک بات یہ بھی دیکھنے کی ہے کہ وہ دماغی لکیر میں کس انگلی کے نیچے پائی جاتی ہیں۔ اگر یہ لکیر کی ابتدا یا مشتری کے ابھار کے نیچے پائے جائیں تو سمجھ لینا چاہئے کہ اوایل عمر میں ایسا شخص بہت ضعیف دماغ رکھتا تھا اور کاپلی کی وجہ سے اس نے کوئی کام نہیں کیا۔ اگر دوسری انگلی یا زحل کے ابھار کے نیچے پائے جائیں گے تو در دسر، ضعف دماغ وغیرہ کی شکایتیں زیادہ پیدا ہوں گی، اگر تیسری انگلی یا شمس کے ابھار کے نیچے پائے جائیں گے تو معلوم ہوگا کہ ایسا شخص آنکھوں کی کمزوری میں مبتلا ہے، اگر چوتھی انگلی یا عطارد کے ابھار کے نیچے ہوں گے تو معلوم ہوگا کہ ضعیفی میں ایسا شخص ضعیف دماغ اور چڑچڑاہو جائے گا۔ مختلف انگلیوں کے نیچے جزائر کے وجود سے اس عمر کا بھی اندازہ لگایا جاسکتا ہے جس عمر میں جاکر یہ دماغی عوارض پیدا ہوں گے۔ پہلی انگلی کے نیچے ہونا ۲۱ سال کی عمر تک کا حال بتاتا ہے۔ دوسری انگلی کے نیچے ۲۲ سال کی عمر تک، تیسری انگلی کے نیچے ۲۹ سے ۶۳ تک۔ اور چوتھی انگلی کے نیچے ۷۱ سال کی عمر سے آگے کا حال ظاہر کریں گے

اگر دماغی لکیر کسی جگہ دفعۃً اوپر کی طرف مائل ہو جائے جیسے (۱-۱) تو معلوم ہوگا کہ اس عمر میں ہپو پنچر کوئی خاص دماغی فشار انسان کو پیدا ہوگا۔ اگر یہ اوپر کو مڑی ہوئی لکیر بہت صاف اور غیر منقطع ہو، تو معلوم ہوگا کہ ایسا شخص کو قحط تا عملی انسان نہیں ہے لیکن اس عمر میں ہپو پنچر عملی یا تجارتی زندگی اختیار کریگا۔

اگر دماغی لکیر سے کوئی اور جدید خط پیدا ہو کر اوپر کی طرف مائل ہو گیا ہو جیسے (۲-۲) تو اس کی جائے وقوع کے ظاہر ہونے سے معلوم ہوگا کہ فلاں حصہ عمر میں کوئی خاص تغیر ہوگا جو رفتار ذہن و دماغ کو ہمیشہ کے لئے بدل دیگا۔ اگر یہ نئی لکیر نیچے کی طرف مائل ہوگی جیسے (۳-۳) تو بہت ہوگا کہ زندگی کے ایک خاص زمانہ میں انسان کی عملی قوت کم ہو جائے گی اور خیال پرستی میں زیادہ منہمک رہیگا۔ اور ممکن ہے کہ زندگی میں یہ تغیر نتیجہ ہو دولت کی کثرت کا علی الخصوص اگر خط شمسی (جس کا ذکر آئے گا) بہت نمایاں ہو

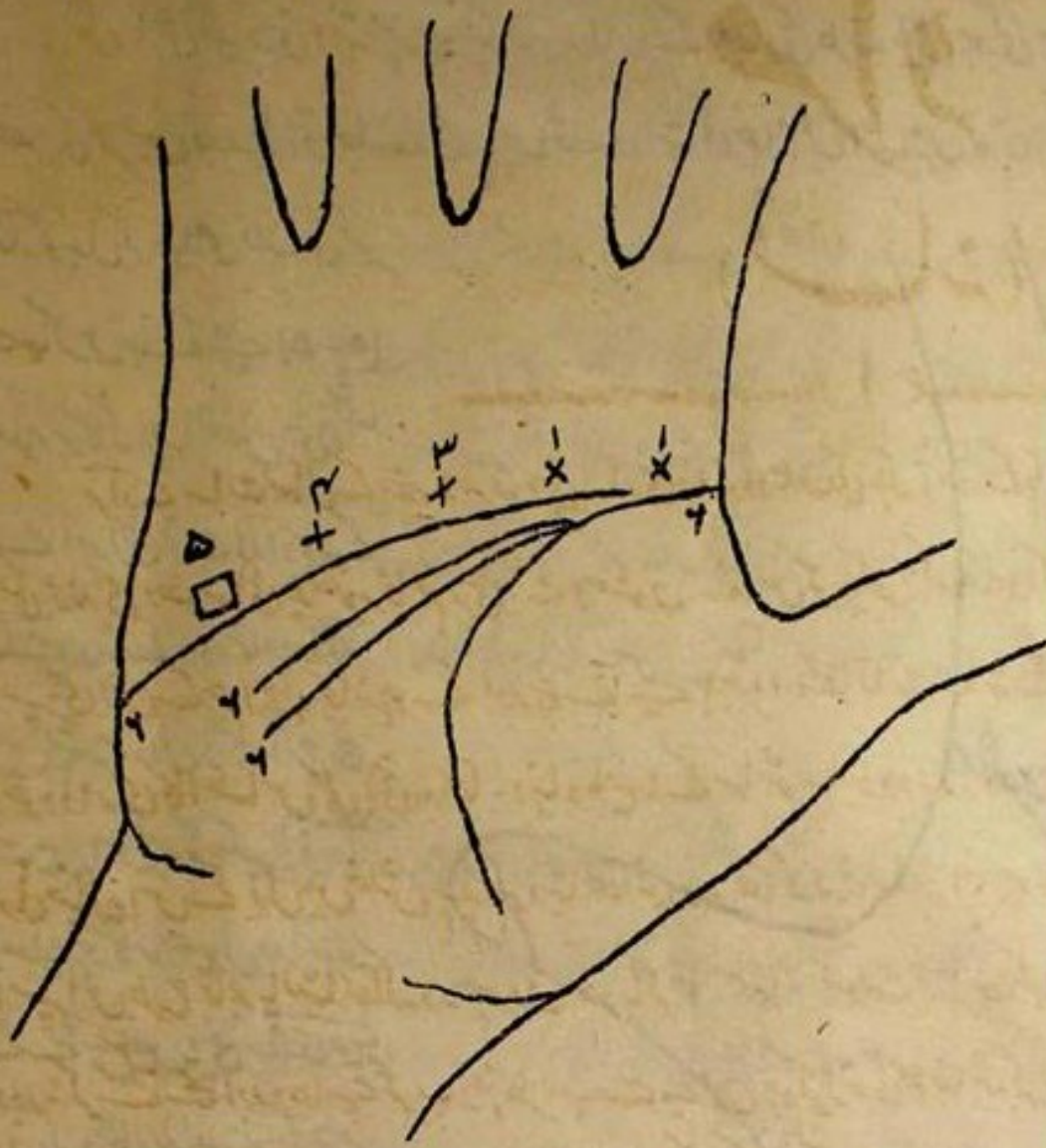
اگر دماغی لکیر اپنی انتہا پر پہنچ کر خود عطار د کے ابھار کی طرف مایل ہو گئی ہو جیسے (۴-۴) تو یقیناً یہ حکم لگا دینا چاہئے کہ ایسا شخص کی عمر جس قدر بڑھتی جائے گی۔ اس قدر دولت کی خواہش اس میں قوی ہوتی جائے گی اگر دماغ کی لکیر اپنی اصلی و فطری رفتار کو بدل کر سیدھی قلب کی لکیر

سے جا کر مل جائے جیسے (۵-۵) تو معلوم ہوگا کہ ایسا شخص اپنی خواہش کے لئے اور اپنی قوت ارادی کے سامنے دنیا کے اور تمام معاملات کو پس پشت ڈال دیگا۔ اگر مربع بات میں اس قسم کی لکیر پائی جائے تو معلوم ہوگا کہ حصول دولت کے لئے یہ شخص اپنی ساری قوت صرف کر دیگا۔ یہاں تک کہ جرم کرنے سے بھی باز نہ آئے گا۔ اگر محض دماغی بات میں پائی جائیگی تو معلوم ہوگا کہ اس کی تمنا ذہنی قوا سے متعلق ہے اور اس کے حصول کے لئے وہ ہر کوشش کو عمل میں لائے گا۔

اگر دماغ اور قلب کی لکیر ملی ہی گئی ہوں جیسے ————— تو سمجھ لینا چاہئے کہ ایسا شخص اپنی سیرت کے لحاظ سے نہایت سخت ہے اور اس کے قلب و دماغ دونوں حصول مقصد کے لئے متحد ہو جاتے ہیں۔ ایسے آدمی کسی کی مصیبت پریشانی میں کبھی کام نہیں آ سکتے۔

دماغی کے لکیر کے اوپر ہی یا اس سے ملے ہوئے نشانات صلیب اس امر کی علامت ہیں کہ دماغ کو کوئی صدمہ پہنچے گا۔ اگر یہ نشان مشتری کے نیچے ہے۔ جیسے (۱) تو معلوم ہوگا کہ صدمہ کا سبب یہ تھا کہ وہ اپنا اقتدار قائم کرنا چاہتا تھا اور اس میں کامیاب

نہیں ہوا۔ اگر یہ نشان زحل کے نیچے ہو جائے
(۲) تو معلوم ہوگا کہ کسی جانور، معدن،
یا کمینہ حملہ کی وجہ سے دماغ کو صدمہ پہنچا
اگر آفتاب کے ابھار کے نیچے ہو جیسے (۳)
تو اتفاقہ گونے کی وجہ سے دماغ کو چوٹ
آئیگی۔ عطارد کے ابھار کے نیچے اس
نشان کے ہونے سے معلوم ہوگا کہ کسی
علمی تجربہ کی وجہ سے دماغ کو صدمہ پہنچا
اگر دماغی لکیر سے ملا ہوا کوئی مربع
نشان ہوگا تو جس ابھار کے نیچے ہوگا
اس کی خصوصیات میں استقلال کو ظاہر
کہے گا۔ دماغی لکیر دھری جیسے (۶-۷)



بہت کم پائی جاتی ہے۔ لیکن اگر کسی میں دونوں لکیریں صاف صاف پائی جائیں تو معلوم ہوگا کہ ایسا شخص دو مختلف قوتیں دماغ میں رکھتا ہے
لیکن یہ کوئی اچھی قسم کی لکیر نہیں ہے اور ایسے شخص کو کامیابی بہت کم ہوتی ہے۔
دماغی لکیر کا مطالعہ کرتے وقت یہ بھی دیکھنا چاہئے کہ بات کی ساخت کس قسم کی ہے (بات کی مختلف ساخت کا ذکر اور ان کے
خصوصیات کا ذکر پہلے آچکا ہے) اور اسی لحاظ سے حکم لگانا چاہئے۔ (باقی)

تین کتابیں

الفاروق :- مکمل ہر دو حصے نقشہ دنیا کے اسلام علامہ شبلی نعمانی
کی سیرت حضرت عمرؓ پر مشہور کتاب قیمت ۴۰ خطوط شبلی عطیہ بیگم فیضی
اور زہرا بیگم فیضی کے نام قیمت ۴۰ نقش ارشدنگ جلال الدین
صاحب اکبر کی نظموں کا مجموعہ قیمت ۴۰ (مینجر نگار نظیر آباد لکھنؤ)

علامہ جرجی زیدان اڈیٹر الملل مصر کے چار
نہایت مشہور عربی ناولوں کا ترجمہ

حجاج بن یوسف عمر عروس مصر عمر
عبدالرحمن ناصر عمر امین بک بارہ آنے
مینجر نگار بک ایجنسی نظیر آباد لکھنؤ

مراد (فسانہ)

(۱)

مراد نے سات سال کے اندر نہ صرف اپنی ساری جائیداد تلف کی بلکہ آئندہ کے پاس بھی جو کچھ تھا اسکو بھی صہباؤ منرا میر کی نذر کر دیا اور اسکی زندگی دھو سنا کی بدستور قائم رہی۔ ”مے و معشوق“ نے اس کو یہاں تک رسوا کیا کہ آخر کار وہ اپنے ممتاز عہدہ سے برطرف کر دیا گیا۔ اسپر بھی اس کے حواس بجا نہ ہوئے اور ہوتے کیسے؟ مراد اتفاقات زمانہ کے ہاتھوں کچھ ایسا مٹ چکا تھا کہ اب اس میں غیرت و خود داری کا احساس بھی باقی نہ تھا۔ دنیا و مافیہا کے ساتھ ساتھ وہ روز بروز اپنی ذات کو بھولتا چلا جاتا تھا۔ ہاں اگر کبھی کبھی کوئی خیال اس کے دل میں خلش پیدا کر دیتا تھا تو وہ نہ تھا کہ اپنے ساتھ اپنی بیوی کی زندگی بھی غارت کر رہا ہے۔ بعض اوقات تو خیال اسپر اس طرح قابو پالیتا تھا کہ وہ پہروں رویا کرتا تھا۔ اسوقت شراب و کباب یا رقص و سرور بھی اس کی تلخیوں کے احساس کو دور نہ کر سکتے تھے اور وہ اپنے کرب و مضطراب سے بے بس ہو کر زندگی کا خاتمہ کر لینا چاہتا تھا۔ اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ مراد کی طبیعت میں فطرتاً جو لطیف عناصر موجود تھے وہ کبھی کبھی اسکو ابھار کر سطح عام سے بلند کر دیتے تھے۔

مراد فیض آباد کے ایک سربراہ اور وہ خاندان کالا کا تھا۔ اس کی تعلیم و تربیت بڑے بڑے اربانوں سے ہوئی تھی۔ جدید تعلیم کے ساتھ ساتھ اس کو مذہبی اور اخلاقی حیثیت سے بھی پختہ مغز بنا دیا گیا تھا اور اس کی طبیعت قدیم و جدید کے اختلاط کی بہترین مثال تھی۔ باوجود اس کے کہ وہ اپنے مان باپ کا اکلوتا لڑکا تھا اس میں ان کمزوریوں کا شائبہ بھی نہ تھا جو عموماً بڑھے ہوئے لاڈ پیار کا نتیجہ ہوا کرتی ہیں۔ دور نزدیک مراد محسن سیرت کے لحاظ سے ایک قابل تقلید نمونہ سمجھا جاتا تھا۔ مختصر یہ کہ وہ ایک ہونہار لڑکا تھا اور گھر والوں کی بڑی بڑی امیدیں اُس سے وابستہ تھیں۔ ہر شخص کو یقین تھا کہ اس کے ہاتھوں اس کے خاندانی اقبال کا ستارہ اور بھی چمک اٹھیں گے۔

ہاجرہ مراد کی پھوپھی کی لڑکی تھی۔ وہ اس کا بچپن سے دلدادہ تھا۔ ہاجرہ اور مراد نے ایک ہی گھر میں پرورش پائی تھی۔ مذاق کی کیرنگی اور طبیعت کی ہم آہنگی نے دونوں کو ایک دوسرے کا گرویدہ بنا دیا اور گردیدگی آہستہ آہستہ اس حد تک پہنچ گئی جہاں سے ہٹنا محال نہیں تو دشوار ضرور ہوتا ہے اب نہ ہاجرہ مراد کو بھول سکتی تھی نہ مراد ہاجرہ کو۔ دونوں کی وابستگی کا یہ انداز دیکھ کر خاندان میں یہ طے پا چکا تھا کہ آگے چل کر وہ ایک دوسرے کے رفیق زندگی بنائے جائیں گے۔ مراد اس طرف سے مطمئن ہو گیا تھا۔ چنانچہ جب انٹرنس کے بعد اسکو

اگر آپ عمدہ عطر کے طالب ہیں تو ایک مرتبہ صفر علی محمد علی تاجر عطر لکھنؤ سے مل جائیے۔

لکھنؤ جانا پڑا تو اس کا سرمایہ تسکین صرف یہ خیال تھا کہ ہاجرہ بہت جلد اس کا ایک اپنا گھر بسائیوالی ہے۔ ہاجرہ بھی اُسکو اپنا ستراج مان لگی تھی اور بے صبری کے ساتھ اس دن کا انتظار کر رہی تھی جب اس کے اور مراد کے درمیان کوئی حد فاصل نہ ہوگی۔ لکھنؤ سے بی اے کرنے کے بعد مراد آئی۔ سی۔ ایس کرنے کی غرض سے انگلستان بھیج دیا گیا تھا۔ اس دوران میں اس کے والد کا انتقال ہو چکا تھا۔ بیوہ ماں کے جینے کا سہارا اب صرف یہ امید تھی کہ اس کا مراد فارغ التحصیل ہو کر بہت جلد لوٹنے والا ہے اور اس کے سرسرا ہندھنے والا ہے۔ مراد لوٹا اور اپنی خدمت پر مامور ہو گیا۔

شادی کو تقریباً دو مہینے رہ گئے تھے۔ سرد سامان ہسٹا کئے جا رہے تھے۔ ہاجرہ کے لئے مکان میں ایک نئے حصہ کا اضافہ ہو چکا تھا۔ مراد اپنی آئندہ زندگی کے نقشے درست کر رہا تھا۔ دفعتاً ہاجرہ کو ایک روز شام کو شدید تپ چڑھ ہی چند گھنٹوں کے بعد معلوم ہوا کہ ذات الریہ ہے۔ مراد اس وقت بارہ بنکی میں تھا۔ اُسکو اطلاع ملی تو ایک واقعہ تو اُسکو چکر آگیا مگر اس نے اپنے کو سنبھالا اور دل کو یہ تسلی دیتا ہوا کہ شاید خدا اسکی معصومیت اور گناہی کے صلہ میں اب بھی اسکی ہاجرہ کو بچائے۔ وہ فیض آباد چل کھڑا ہوا یہاں آکر معلوم ہوا کہ اسکی لکشمی اس کی زندگی کو معمور کرنے سے پہلے مٹا کر چلی گئی ہے۔ ہاجرہ سپرد خاک ہو چکی تھی۔ مراد پر آسمان ٹوٹ پڑا اور کلیجہ تھام کر بیٹھ گیا۔ اس کی آنکھوں کے آگے دنیا اندھیری ہوئی جو فضا ابھی تک صاف و شفاف تھی یکایک گرد و غبار سے اٹ گئی اور مراد کی زندگی کے اوراق پیس سے سیاہ ہونے لگے۔

انسان کے بننے بگڑنے کے لئے ایک اشارہ کی ضرورت ہوا کرتی ہے۔ وہ صرف چند لمحے ہوتے ہیں جو قسمتوں کا فیصلہ کرتے ہیں۔ پس ایک بہانہ چلے آئے اور زمین آسمان اور آسمان زمین ہو جاتا ہے۔ اس جانکاہ واقعہ کے بعد ایک دور تو عجیب انتشار میں گزرا یعنی اسکی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا کرے اور کس طرح اپنا جی بھلائے۔ مگر آخر کار اُس نے ”مے و مینا“ سے شغل شروع کیا اور جن آزمائشوں سے وہ یورپ کی فضا میں بھی متاثر نہ ہوا تھا اب اپنے کو اکدم ان کے حوالہ کر دیا۔ اس سے واقعی وہ اپنے درد کے احساس کو بھولا یا نہیں اس کا جواب خود اس کی آئندہ زندگی دیگی۔ لیکن اتنا ضرور ہے کہ اس نے اپنے دنیا کی تمام آزمائشوں کے ہنگامہ میں چھوڑ کر دنیا کے فرائض سے سبکدوشی حاصل کرنی شراب کو ”ام الخبائث“ کہا گیا ہے مراد نے اس کو منہ لگا کر گویا ہر برائی اپنے لئے جائزہ کرنی۔ شب دروزہ تھمپٹ یا کسی ”نازنین“ کے پہلو میں بسر کرنے لگا۔ لیکن قیاس سے معلوم ہوتا ہے کہ کبھی کبھی اس کی آنکھوں سے پردے ہٹ جاتے تھے اور وہ یہ سمجھنے لگتا تھا کہ یہ سب خود فریبی ہے ورنہ اصلیت یہ ہے کہ اس کا درد بدستور قائم ہے۔

ہاجرہ کی موت کے سال بھر بعد لوگوں نے تحریک شروع کی کہ مراد شادی کرے۔ مراد کو بھی خیال ہوا کہ شاید اس طرح وہ اپنی محرومی کو بھول جائے اور ایک عورت کے ہاتھوں ممکن ہے اس کی نجات ہو جائے۔ چنانچہ بڑی جستجو کے بعد اس نے آمنہ کے ساتھ شادی کر لی جو بریلی کے ایک متدب اور تعلیم یافتہ خاندان کی لڑکی تھی۔

(۲)

میرے ایک دوست کا خیال ہے کہ تامل کی زندگی بچا پس فیصدی صرف اس لئے بد مزہ رہتی ہے کہ فریقین میں سے کسی نہ کسی کو پہلے سے محبت میں ناکامی ہو چکی ہے۔ میرے دوست کا یہ دعویٰ صحیح ہو یا غلط مگر یہ واقعہ کہ یہاں مراد اور آمنہ دونوں محبت کی لذتوں سے آشنا ہو چکے تھے۔ شاہد آمنہ کا رشتہ دار تھا اور اس سے دو سال عمر میں چھوٹا تھا۔ بچپن سے آمنہ کی تصویر اس کے دل پر اس طرح اتر گئی تھی کہ اب ملنے نہ مٹ سکتی تھی جس سال آمنہ کی شادی ہوئی ہے اسی سال شاہد ایم۔ اے کر کے لاہور میں فلسفہ کا پروفیسر ہو گیا تھا۔ آمنہ کی شادی کا علم اسکو ہوا تو اس کی کیا حالت ہوئی اس کا صحیح جواب نہیں دیا جاسکتا۔ اس کے تیور سے اس کے جذبات کا کوئی اظہار نہ ہوتا تھا۔ وہ فلسفی اور شاعر تھا اور طبعاً خاموش اور سنجیدہ۔ وہ اپنی مایوسیوں کو قابل احترام سمجھتا تھا اور ان کو رسوا کرنا نہ چاہتا تھا۔ وہ آمنہ کی محبت کرتا تھا اور اسی کو اپنی زندگی کی سب سے بڑی نعمت سمجھتا تھا۔ اس کو اسکی بھی فکر نہ تھی کہ آمنہ ممکن ہے اپنی نئی ضرورتوں میں اسکو بھول جائے۔ وہ خود آمنہ کو پوچھتا تھا۔ اور اس کا ایسا یہ تھا کہ اس طرح وہ اپنے نفس کی تربیت کر رہا ہے وہ کہا کرتا تھا کہ دنیا کی ساری کتابیں ہضم کر جانے سے اس کو وہ چیز نصیب نہیں ہوگی جو آمنہ کی محبت سے نصیب ہوئی ہے۔ بہر حال شاہد پر شکست آرزو کا الٹا اثر ہوا اور آمنہ کو اور بھی محویت اور یکسوئی کے ساتھ چاہنے لگا۔ وہ خود مراد کے مقابلہ میں غریب تھا اسکو قوی امید تھی کہ مراد آمنہ کی زندگی کو زیادہ خوشگوار بنا سکیگا اور وہ اس خیال سے بہت خوش تھا۔

ہندوستان کی عورت صرف شوہر پرستی کے لئے بنائی گئی۔ "بہت بھگتی" کا تخیل یہاں عملی صورت میں پیش کیا گیا ہے دنیا کے کسی دوسرے حصہ میں اسکی نظیر نہیں مل سکتی۔ ہندوستان کی آب و ہوا بھی کچھ اس کے لئے موافق ثابت ہوئی۔ زمانہ نے کروٹوں پر کروٹیں بدلیں۔ انقلاب پر انقلاب ہوتے رہے۔ مگر ہندوستان عورتوں کے معاملہ میں جہاں تھا وہیں رہا۔ البتہ موجودہ صدی نے طبقہ اناث میں چند ایسی ہستیاں پیدا کر دی ہیں جو "روایات قدیم" کے قیود سے عورتوں کو آزاد کرنا چاہتی ہیں لیکن ان کی صدائے احتجاج "نقار خار" میں طوطی کی آواز" سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی

آمنہ یوں تو کہنے کے لئے نئی روشنی میں ملی تھی لیکن ہندی آخر ہندوستان کی عورت۔ اس نے ایک سال کی قلیل مدت میں نہ صرف شاہد کو اپنے دل سے بھلایا بلکہ مراد کے ساتھ ایسی موانست اور کج ہمتی پیدا کر لی جسپر محبت کا گمان ہوتا تھا۔ لیکن دراصل ایسے لگاؤ کو قلب و روح سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ شادی کے بعد عورت کی انفرادیت عموماً فنا ہو جاتی ہے۔ آمنہ پہلے سمجھتی تھی کہ مراد کو سدھار لیگی لیکن اس کی یہ اُمید ہم سے زیادہ نہیں ثابت ہوئی۔ اس کے ایک لڑکا بھی پیدا ہوا اور مراد کو اپنی ذمہ داریوں کا احساس نہ ہوا۔ وہ اپنی گندی زندگی کا خوگر ہو گیا تھا جب انسان سمجھ سمجھ کر اپنے کو دھوکہ دینے لگتا ہے تو کوئی قوت اس کو روہ راست پر نہیں لاسکتی یہی حالت مراد کی تھی۔ وہ محسوس کر رہا تھا کہ روز بروز اس کی پرانگی میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے پھر بھی اپنی بے اعتدالیوں سے منہ نہ موڑ سکتا تھا

”ترداسنی“ اس کے جینے کا بہانہ تھی ورنہ وہ اتناک خودکشی کر چکا ہوتا۔

مراد کو بہت جلد اپنی نئی غلطی کا علم ہو گیا۔ آئمنہ سے شادی کر کے وہ تازہ آفت میں گرفتار ہو گیا۔ اس کو یہ خیال سننے لگا کہ اپنے ساتھ وہ اپنی بیوی کو بھی برباد کر رہا ہے اور اس کو وہ ایسا گناہ سمجھ رہا تھا جس کا کوئی کفارہ نہیں۔ جائداد کا جو حصہ باقی رہ گیا تھا اس کے اس نے آئمنہ کے نام لکھ دیا تھا۔ مگر آئمنہ نے رفتہ رفتہ پھر اس کو مراد کی نذر کر دیا۔ یہی نہیں بلکہ میکہ سے جو کچھ لائی تھی اُسے بھی حوالہ کر دیا اور اب اس کی عسرت سے بسر ہو رہی تھی۔ شوہر کی خوشنودی کا جہاں یہ معیار ہو وہاں محبت کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔ آئمنہ صد پرصدے اور کوفت پر کوفت اٹھا رہی تھی مگر زبان سے ا ف نہ کرتی تھی۔ مراد کو خود اس کا دکھ تھا لیکن کوئی چارہ اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا۔ آئمنہ کے والدین نے اکثر چاہا کہ دونوں میں جدائی کرادیں مگر آئمنہ اس کی روادار نہ تھی۔

جب مراد ایک نہایت کمینہ جرم کی سزائیں اپنی ملازمت سے برخاست کر دیا گیا تو خود اس نے طے کر لیا کہ اب آئمنہ کو آزاد کر دے گا اور خواجواہ اس کی زندگی تلخ نہ کرے گا۔ اس نے رو کر آئمنہ سے کہا ”دیکھو آئمنہ میں نے بہت چاہا کہ تمہارے لئے اپنے کو پستی سے ابھاروں خود تم نے اس معاملہ میں اپنا پورا زور لگایا مگر تم کو معلوم ہو گیا ہو گا کہ میری اصلاح ناممکن ہے اور میرے ساتھ رہ کر تمہاری بربادی لازمی ہے میں اب اس کی تاب نہیں لاسکتا۔ سیاہ قلب ہونے کے باوجود ابھی مجھ میں اچھا برا سوچنے کی قوت باقی ہے میں اس قابل نہیں کہ تمہارے حسن اور تمہاری محبت سے اپنی زندگی کو پر کیف بنا سکوں۔ میں اب جاتا ہوں اور کہیں اپنی شرناک ہستی کو اس طرح چھپاتا ہوں کہ کسی کو یہ بھی علم نہ ہو گا کہ زندہ ہوں یا مر گیا۔ تم دلشرا اپنے لئے دوسری دلچسپیاں مہیا کر لو میں امید کرتا ہوں کہ تم کس معاملہ میں کوئی وقت نہ ہوگی۔ شاہد اب بھی موجود ہیں۔ اس کو بھول جاؤ کہ مجھ جیسی ناپاک ہستی سے کبھی تمہارا دامن باندھا گیا۔ پھر تم سکوں دھاتیت کے سانس لے سکوگی۔ میں جس گرداب میں بہ رہا ہوں بہنے دو۔ اس زندگی میں میری نجات ہونیوالی نہیں خواجواہ کوفت نہ اٹھاؤ میں نے اس سے پہلے بھی بار بار یہی چاہا تھا لیکن اس خیال سے کچھ کرنے سکا کہ علم کو لال ہو گا۔“

مراد اس کے بعد بڑی دیر تک روتا رہا۔ آئمنہ بھی اس کے جسم سے لگی ہوئی رد رہی تھی۔ آج اس کو اپنا غبار نکالنے کے لئے کافی موقع مل گیا تھا۔ مراد نے شاہد کا نام لیکر اس کی رگوں میں ہلکا سا ہتھکڑیاں پیدا کر دیا تھا اور اب اس کے جذبات مخلوط تھے۔ آئمنہ نے خوشامدی میں کہیں۔ ہاتھ جوڑے قسمیں دلائیں۔ مراد نے ایک نہ سنی اس کا دل تپھر کا ہو گیا تھا وہ اسی میں آئمنہ کی ہیبت سمجھتا تھا کہ اس کو ہمیشہ کے لئے چھوڑ دے۔ اس کے پاس اب بھی کچھ روپے موجود تھے اس میں سے نصف آئمنہ کے نام بینک میں جمع کر کے اور نصف اپنے گزراوقات کے لئے لیکر بمبئی چلا گیا اور ایک مختصر سا مکان لیکر رہنے لگا۔ اب وہ ایسا محسوس کر رہا تھا کہ اس کے سر سے ایک بھاری بوجھ اتر گیا ہے اس کے بعد اس نے پھر کبھی آئمنہ کی صورت نہیں دیکھی۔ اس نے بمبئی میں ایک سیٹھ کے وہاں ڈیڑھ سو ماہوار کی نوکری بھی کر لی تھی جس سے وہ اپنی رکیک خواہشوں کو پورا کرنے کے لئے کافی سامان ہم پہنچا سکتا تھا۔

(۱۳)

کچھ دنوں بعد آمنہ کو اس کے میکہ والوں نے بلالیا۔ اب ان کو فکر تھی کہ کسی طرح مراد کو مجبور کیا جائے آمنہ کو طلاق دلوادین اور پھر شاہد کے ساتھ شادی کر دیں۔ چنانچہ مراد کا پتہ لگایا گیا اور اس کو اس کی بابت لکھا گیا۔ اس نے مختصر جواب میں لکھ دیا کہ بہت جلد اس کا انتظام کر دنگا۔ اور خاموش ہو رہا۔

اب آمنہ کی دلہنگی کا اگر کوئی ساماں تھا تو اس کا لڑکا تھا جس کی عمر تین سال کی تھی۔ اس کی انتہا مسرت اسی بچہ کی دیکھ بھال تھی۔ آمنہ اپنے کو اس قابل بھی نہ پاتی تھی کہ شاہد سے کسی قسم کی امید لگائے۔ اس کا وہ اپنے کو حقدار نہیں سمجھتی تھی۔ وہ اب بھی اسی کو غنیمت سمجھتی تھی کہ مراد اس کے پاس واپس آئے اور اپنی روش کو بدل کر سکون کے ساتھ زندگی کے باقی دن گزار دے اس نے مراد کو خط پر خط رد نہ کئے لیکن مراد نے کسی کا جواب نہ دیا۔ آمنہ ہر طرح سے مایوس ہو گئی۔ جب وہ گھر میں شاہد کا ذکر سنتی تو اس کو بڑا صدمہ پہنچتا اور وہ اٹھ کر چلی جاتی تھی۔ شاہد کے نام سے وہ گھبرانے لگی تھی۔

قسمت کی ستم ظریفی دیکھئے جس آزمائش سے آمنہ اب تک بچا جا رہی تھی اسی کا مجبوراً سامنا کرنا پڑا جس نے آخر میں سارا نقشہ ہی بول کر رکھ دیا۔ اس کا بچہ بیمار پڑا اور حالت خطرناک ہونے لگی۔ آمنہ کی آخری مسرت بھی اس سے چھن رہی تھی اس کو ہر چار طرف مصیبت ہی مصیبت نظر آ رہی تھی۔ اور اب اس کو یقین ہو گیا تھا کہ جیسا اس کے لئے کوئی معنے نہیں رکھتا ایسے وقت میں شاہد غیر اختیاری طور پر جو کام کر گیا اس نے آمنہ کو اور بھی متفکر کر دیا۔

شاہد گرمیوں کی چھٹیوں میں بریلی آیا ہوا تھا۔ آمنہ کی حسرتناک زندگی کا علم اس کو پہلے سے تھا اور وہ اندر ہی اندر اس فکر میں گھل رہا تھا۔ مگر یہاں آکر اس کو جو دھکا لگا اس کا اسے کبھی گمان بھی نہ ہو سکتا تھا۔ آمنہ اب وہ آمنہ نہ تھی۔ وہ بھول سا چہرہ اب سوکھ کر بالکل بے رنگ ہو گیا تھا۔ جو آمنہ کبھی بغیر مسکرائے ہوئے بات نہ کرتی تھی اب ہر دم گزر جاتے تھے چپ چاپ بیٹھی رہتی۔ اور مسکراتا تو گویا اس نے کبھی سیکھا ہی نہ تھا۔ جو آنکھیں صرف حکومت کے لئے بنائی گئی تھیں اب رحم و لطف کی طالب معلوم ہوتی تھیں یہ سب کچھ تھا لیکن شاہد نے ایک نامعلوم ادا اب بھی اس میں ایسی پائی جو اس سے خراج پرستش وصول کرنے کے لئے کافی تھی وہ آمنہ کو اب بھی منردا ماننے پر مجبور تھا۔

آمنہ کو شش کر کے شاہد سے پہلو بچا رہی تھی اور شاہد بھی اس کا اشارہ سمجھ گیا تھا چنانچہ وہ خود آمنہ سے الگ الگ رہتا تھا آمنہ کے ماں باپ البتہ یہ چاہتے تھے کہ کسی طرح شاہد سے آمنہ ہل جائے اور اپنی کلفتوں کی یاد دل سے مٹا دے۔ لیکن نہ آمنہ کا موقع دیتی تھی نہ شاہد کوئی تحریک کرتا تھا اسی طرح پندرہ بیس دن گزرے۔ ہوں گے کہ دفعتاً آمنہ کا لڑکا بیمار ہوا اور یہ دھوکہ کا حجاب ہٹ گیا۔

شاید آمنہ کی سراسیمگی سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہا۔ اُس نے بلا آپس کی گزشتہ زندگی کی طرف کوئی اشارہ کئے ہوئے بچہ کی تیار داری کرنی شروع کی۔ اُس نے دن کو دن اور رات کو رات نہ سمجھا اور ایک دھن کے ساتھ بچہ کی خدمت لگا رہا۔ آمنہ کا خدا سیدھا تھا۔ اس کا ظفر بائیسویں روز اچھا ہو گیا اور اب آمنہ کو سوچنے کا موقع ملا۔

شاید کے طرز عمل کا جواب اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا۔ نہ تو وہ اسکو احسان سمجھنا چاہتی تھی نہ محبت۔ شاید نے پھر تکلف شروع کر دیا تھا اور آمنہ اب اس سے کچھ گفتگو کر کے اپنی طبیعت کا بوجھ ہلکا کرنا چاہتی تھی۔ ایک دن دونوں تنہائی میں بیٹھے ہوئے تھے۔ شاید سگریٹ پیتا جاتا تھا اور اخبار پڑھتا جاتا تھا۔ آمنہ پر اسکی اس ادا نے گہرا نقش کیا۔ اُس نے تھوڑی دیر غور کیا پھر ایک عجیب اندھناک لہجہ میں شاید کو مخاطب کر کے پوچھا

”کیوں شاید کیا تم مجھ سے کچھ کشیدہ ہو؟“

”شاید کو یہ سوال ناگوار گزر اگر اُس کی آواز اسوقت ایسی دکھ بھری تھی کہ اسکا دل تڑپ گیا اور اُس نے پوچھا ”کیوں؟ تم کو یہ خیال کیوں ہوا؟“ ”کچھ نہیں۔ یونہی تمھاری ہر وقت کی خاموشی سے مجھے گمان ہوا کہ شاید مجھ سے کچھ بکدر ہو“ آمنہ نے جواب دیا اور کسی سوچ میں پڑ گئی۔ شاید نے اخبار کو رکھ دیا اور آمنہ کو غور سے دیکھنے لگا۔ وہ منتظر تھا کہ آمنہ ابھی کچھ اور کہیگی مگر آمنہ کی گویائی اب کام نہیں دیتی تھی۔ وہ آنکھیں جھپکاتے ہوئے اسی طرح سوچتی رہی آخر کار شاید نے کہا ”سنو آمنہ معلوم ہوتا ہے کہ تم کسی غلط فہمی میں مبتلا ہو میں جو اب تک تم کو کھل کر نہیں ملا اُس کی وجہ یہ تھی کہ تم خود مجھ سے بچتی رہی ہو۔ تمھاری حالت اسوقت ایسی ہے کہ خفیف سے خفیف بہانہ تمھارے دل کو اور بھی مجروح کر سکتا ہے اس لئے میں بھی تم سے گریز کرتا رہا۔ درمختص یہ ہے کہ آج تک تم سے کبھی غافل رہا ہوں اور نہ ہو سکتا ہوں تمھاری محبت میرے لئے نئی کیفیتوں کا باعث رہی ہے اور ہمیشہ رہیگی۔ مجھے اس کا بھی ملال نہیں کہ تمھاری شادی دوسرے کے ساتھ ہو گئی ہے۔ ہاں تمھاری المناک زندگی پر البتہ میرا بال بال روتا ہے“ شاید اتنا کہ کر چپ ہو رہا۔ اب اس کی رگوں میں ایک شورش نمودار ہو چلی تھی۔

آمنہ سے ضبط نہ ہو سکا اور اپنے چہرے کو ہاتھوں سے چھپا کر زار زار رونے لگی۔ جب خوب جی کھول کر رو چکی تو شاید کے پہلو میں کرسی کھینچ کر کہنے لگی ”ہاں شاید میں جانتی تھی کہ تم دھن کے پکے ہو تمھاری طبیعت کا رنگ ہمیشہ سے پختہ تھا۔ تم مجھے نہیں بھولے یہ میرے لئے مرٹنے کی بات ہے۔ لیکن دیکھتے ہو خود زمانہ مجھے مٹا رہا ہے میں بھی تم کو چاہتی تھی اور مجھے شادی بے انتہا گراں گزر رہی تھی جب اپنا بس نہ چلا اور مراد کے ساتھ میرا نکاح ہو گیا تو میں نے اپنے مقدر سے موافقت پیدا کرنی اور تم کو بھولنے کی کوشش کرنے لگی اپنی کوشش میں کامیاب بھی ہوئی یا نہیں؟ اس کا جواب دینے کی ضرورت نہیں۔ اس لئے کہ صرف کوشش کر کے تمھاری گتہ کار ہو چکی اور اب مجھے اس کا کوئی حق نہیں کہ تم سے محبت کی امید کروں بلکہ اب تو مجھے اس خیال سے تکلیف ہوتی ہے کہ تم اب تک مجھے اسی طرح

[illegible]

شاہد چند منٹ تک تو آمنہ کا منہ تکتا رہا۔ اس کو کبھی گمان بھی نہ ہوا تھا کہ آمنہ جذبات کی رو میں اس طرح طوفان برپا کر سکتی ہے۔ اس قیامت خیز منظر کا اسپر یہ اثر ہوا کہ اُس نے سوا اس کے ایک حرف نہیں کہا کہ ”ہاں ضرور جاؤں گا اور جہاں تک ہو سکے گا تمہاری مدد کروں گا۔“

شاہد کا اعتقاد یہ تھا کہ آئمہ کے حسب منشاء کام کر کے وہ اپنی محبت کو غیر فانی بنا سکتا ہے۔ چنانچہ جب کبھی آئمہ نے کسی خواہش کا اظہار کیا اس نے بلا چون و چرا کے اس کے مطابق عمل کیا۔ وہ اس راز کو جانتا تھا کہ اس جگہ فلسفہ و منطق کو کوئی دخل نہیں۔ ذوق و وجدان کو وہ عقل کے ہاتھوں گنداکرنا نہیں چاہتا تھا۔

یقین دن بعد اس نے بمبئی جانے کے لئے سامان کیا اور آئینہ کو دلاسا دے کر روانہ ہو گیا۔ آئینہ نے پھر غور کیا تو شاہ کی یہ ادا
اس کے دل میں گھر کر گئی اور وہ اپنی ذات سے شرمانے لگی۔ اس دن سے شاہ کا تصور ایک لمحہ کے لئے بھی اس کے ذہن سے نہیں ٹلا۔ شاہ
واقعی فرشتہ تھا۔

اگر آپ عمدہ عطر بدنا چاہتے ہیں، تو صوفی علم امجد علی، تاج عطر لکھنؤ سے منگائیے

(۴)

مراد بمبئی پہنچ کر اور بھی بے لگام ہو گیا تھا۔ شراب اور عورت کے سوا اسکو معلوم بھی نہ تھا کہ دنیا میں کوئی اور چیز بھی ہے۔ وہ سرستی اور
 بنجودی کے عالم میں اپنے دن کاٹ دینا چاہتا تھا۔ اس لئے کہ وہ اپنی اس زندگی سے بیزار تھا اور ناکامی کے روح فرسا احساس کو برداشت
 نہیں کر سکتا تھا۔ دن رات کی شراب نے اس کی صورت کو مسخ کر دیا تھا۔ اس کو اسکی فکر نہ تھی۔ اس کو ہوش بھی نہ تھا کہ صبح کب ہوتی ہے
 اور شام کب۔ اسی عالم ہے حسی میں اس کو آئینہ کے والدین کی تحریر ملی حسین آئینہ کے لئے اس سے طلاق مانگا گیا تھا وہ سمجھتا تھا کہ
 وہ جب کچھ ملے کر چکا ہے اور اس کو اک گونہ یکسوئی تھی لیکن اب معلوم ہوا کہ جب تک وہ آئینہ کو بھی اپنے ساتھ منظر عام پر لا کر ذلیل و رسوا نہ کرے گا
 دنیا و اے چین نہ بین گے اس کی بے چینیوں کا دورہ پھر شروع ہوا اور اس کی عقل کام نہ دیتی تھی کہ کیا کرے۔ اس کی تندرستی روز بروز
 سرعت کے ساتھ خراب ہو رہی تھی اور اپنی وہ موت کا بے صبری کے ساتھ انتظار کر رہا تھا۔ مگر جس بات کا کوئی وقت متعین ہو اس کا
 انتظار ہی کیا۔ مراد نے بریلی لکھنے کو تو لکھ دیا کہ میں انتظار کر رہا ہوں کہ آئینہ کو قانوناً آزاد کر دوں۔ لیکن دراصل کوئی فیصلہ نہ کر سکا تھا
 مراد اسی ادھیڑ میں پڑا تھا کہ شاہد پنپا مراد کی خلش اور بڑھ گئی۔ جو وقت شاہد مکان میں داخل ہوا۔ مراد نشہ میں جو پڑا تھا
 اور مینا ہارمونیم پر کچھ گا کر اس کو سنار ہی تھی۔ بمبئی میں مراد نے کئی عورتوں سے مراسم پیدا کئے اور چھوڑ دے تھے۔ اب اسکو مینا کے
 ساتھ انہماک تھا جو ایک مشہور تھیٹر میں ایکٹرس تھی اور گانے کی ماہر تھی اس کی آواز میں ایسا بوج تھا جس نے سارے شہر کو مبہوت
 کر رکھا تھا۔ نہ جانے کتنے کرہ ڈپٹی اس کے "آستیاں ناز" پر زمین بوس ہونے کے آرزو مند تھے لیکن مینا کے استغنا اور انداز بے نیازی
 نے انکی آرزوں کو دل ہی دل میں پامال کر دیا۔ ہاں اگر وہ خود کسی کی تمنائی تھی تو مراد کی۔ مراد تو ادل ادل یہ سمجھتا تھا کہ اس سے بھی چند روز
 ربط رہیگا لیکن وہ اب تک اس سے تعلق قطع نہ کر سکا تھا اور بظاہر مینا کے ساتھ اسکی مصروفیت دیر پا اور مستقل معلوم ہوتی تھی۔
 شاہد کو یہ دیکھ کر مراد کسی قدر گھبرا گیا مگر پھر اپنے کو سنبھال کر اٹھا اور آگے بڑھ کر تپاک کے ساتھ بغلگیر ہوا شاہد نے ایک ہی
 نگاہ میں جان لیا کہ زندگی اس کے لئے ایک عذاب ہو کر رہ گئی ہے جبکہ وہ زیادہ دنوں تک برداشت نہیں کر سکیگا اس کا مجنوں چہرہ
 اس بات کا گواہ تھا کہ وہ اپنے کو صرف دھوکہ دے رہا ہے درحقیقت وہ دنیا کی کسی چیز سے لطف حاصل کرنے کی صلاحیت بھی کھو چکا
 مراد نے کچھ دیر تک ادھر ادھر کی باتیں کیں۔ پھر مینا کی طرف اشارہ کر کے کہا "شاہد میں ان کا تعارف کرانا چاہتا ہوں یہ بمبئی
 کی ایک مشہور ایکٹرس ہیں اور گانے میں شاید سرسوتی یا آرفیوس ان کا مقابلہ کر سکے تو کر سکے۔ آج کل میرے جینے کا بھانہ صرف ان کی
 ذات ہے اس سے زیادہ تم خود تھوڑی دیر میں معلوم کر لو گے" یہ کہہ کر اس نے مینا سے کچھ گانے کی فرمائش کی۔
 مینا نے نہایت متانت کے ساتھ اپنی سفید ریشمی ساری کا آنچل برابر کر کے گانا شروع کیا۔ بس ایسا معلوم ہوتا تھا کہ عالم بالا
 کھینچ کر اس دنیا کی طرف جلا آرہا ہے۔ سارا کرہ ایک ایسی نئی فضا سے معمور ہو گیا تھا جو اس دنیا کی چیز نہ تھی۔ خود شاہد اپنی رگوں میں ایک

لہر محسوس کر رہا تھا۔

جاڑے کی رات تھی۔ ۹ بج گئے تھے۔ شاہد اپنا پیغام سنانے کے لئے بے صبر ہو رہا تھا لیکن اس رات کو وہ مراد سے کوئی کام کی بات نہ کر سکا۔ مراد نے اس کے دیکھتے دیکھتے ”کاگ ننگ“ کے ساتھ گلاس خالی کر دئے تھے اور اب وہ بات کرنے کی تاب نہیں رکھتا تھا۔ کچھ دیر تک اس نے مذہبی اور اخلاقی حیثیت سے انسان کے اعمال پر اور ان کے مکانات پر ایک لمبی چوڑی تقریر کی۔ درمیاں میں اپنی بدکرداریوں پر کئی بار رویا بھی۔ آخر کار جب اتنی تاب بھی نہ رہی تو لڑکھڑاتا ہوا آرام کر سی سے اٹھا اور بلا کچھ کہے جا کر پلنگ پر بے حس و حرکت ٹیٹ گیا۔ مینا نے مراد پر ایک حسرت ناک نگاہ ڈال کر شاہد سے کہا ”مجھے بڑی فکر رہتی ہے کہ آخر اس کا انجام کیا ہونے والا ہے؟ میں اپنی تمام قوت اس کوشش میں صرف کر چکی ہوں کہ انکی یہ گری ہوئی حالت سنبھل جائے۔ مگر یہ خود زندگی سے کچھ ایسا ہینزار معلوم ہوتے ہیں کہ کسی کی کوئی تدبیر نہیں چل پاتی۔ مجھے نہ جانے ان کے ساتھ کیوں محبت ہو گئی ہے حالانکہ یہ محبت کی چیز نہ تھے۔ مجھے ان کا بڑا دکھ ہے“ مینا کے ایک لفظ سے بوسے خلوص آرہی ہے جس کی اس قماش کی عورتوں سے توقع نہیں کی جاسکتی۔ شاہد نے ایک ٹھنڈی سانس لیکر کہا اپنی سعی ناکام کا آپ ہی کو غم نہیں ہے اس سے پیشتر وہ ہستی ان کو سیدھی راہ دکھانے کی کوشش میں مایوسی اٹھا چکی ہے جس کو ابھی اصلاح کا دعویٰ کرنے کا واقعی حق تھا مگر اب خدا ہی ان پر رحم کرے“ اس کے بعد مینا شاہد کو کھانا کھلانے لی گئی۔

رات بھر شاہد نے خیالات کے تلاطم میں گزرا دی۔ اُس کو مراد کی حالت پر ترس آ رہا تھا۔ اور آمنہ کی خستہ حالی پر تو اس کا دل ہی خون ہو رہا تھا۔ اور اسپرستزاد اس کے اپنے جذبات جو آمنہ سے تعلق رکھتے تھے۔ غرض کہ شاہد کی رات عجیب خلفشار میں کٹی۔

صبح ہوتے ہوئے شاہد کی آنکھ لگ گئی تھی۔ ایک گھنٹہ بھی نہ ہوا تھا کہ کسی کے قدموں کے چاپ سے اسکی نیند اچٹ گئی۔ مراد نے شرمندگی کا اظہار کرتے ہوئے کہا ”شاہد مجھے معاف کرنا میری رات کی حالت نے شاید تمھیں بے کیف کر دیا ہو لیکن میری گزشتہ نو دس سال کی زندگی پر غور کرتے ہوئے مجھ رو سیاہ کو معاف کر دو۔ میں نے اس وقت تمھارے آرام میں خلل ڈالا ہے۔ مگر وہ اس لئے کہ تم سے پہچرٹنائی میں اطمینان سے گھٹو کرنے کا موقع نہیں ملیگا۔ ایک گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ میں مینا ناشتہ وغیرہ تیار کر کے ہماری صحبت میں شریک ہو جاؤ گی اور اس کے بعد میں سر کھپانے دفتر چلا جاؤں گا۔ اور شام کو پھر وہی پروگرام رہے گا جو کل تم دیکھ چکے ہو اس لئے ابھی جو کچھ باتیں کرنا ہو کرلو پہلے یہ بتاؤ تمھارا یہاں آنا کس غرض سے ہوا؟“ یہ کہہ کر اس نے شاہد کو ایسی مترجم نگاہ سے دیکھا گویا خوب جانتا تھا کہ اس کے آنکلی تقریب کیا ہے۔ اس کی آنکھوں میں خمارِ شب کے آثار باقی تھے اور وہ صورت سے مخبوط معلوم ہوتا تھا۔

شاہد نے متین اور سنجیدہ تیور دے سے چند منٹ تک دیکھا اور مراد کے دل کی گہرائیوں کا جائزہ لیکر آمنہ کا پیغام اُس کی زبان میں سنا دیا اور پھر اُسکی زار و زبوں حالت کا نقشہ کھینچ کر کہا "اگر تم اس کی بہتری کے لئے کچھ کر سکتے ہو تو کرید" شاہد لب و لہجہ کسی قدر خشک تھا۔

مراد کو بھولی ہوئی المناکیاں یاد آگئیں۔ اس نے چند منٹ محویت کے عالم میں گزارے۔ پھر شاہد سے کہنے لگا "میں جانتا تھا کہ تم اسی لئے آئے ہو۔ مگر صرف ایک امید موہوم تھی کہ شاید تمھاری کوئی اپنی غرض تم کو لے آئی ہو۔ یعنی میں فیصلہ کن لمحہ سے بچنا چاہتا تھا۔ خیر انسان اپنی زندگی میں دنیا کے واقعات سے بھاگ کر کہاں جاسکتا ہے مگر خدا کے لئے جو کچھ میں کہنا چاہتا ہوں اس کو غور سے سنو اور انصاف سے بتاؤ کہ میں کیا کروں۔ میں تسلیم کرتا ہوں کہ میں نے ایک بہت بڑی غلطی کی یعنی آمنہ کے ساتھ شادی کر لی مجھے اُمید تھی کہ میں ایک خوبصورت اور خوش سلیقہ بیوی کے ہاتھوں بن سکتا ہوں اس میں بڑا دھوکا ہوا۔ لیکن جب اس غلطی کو درست کیا جاسکتا ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ خواجہ نثار ہوں۔ مجھے کامل یقین ہے کہ آمنہ کی زندگی خوشگوار بن سکتی ہے۔۔۔۔۔"

"تم پھر دھوکہ میں ہو" شاہد نے بناٹ کاٹ کر کہا "اسکی بگڑی ہوئی حالت کا تم کو کوئی اندازہ نہیں۔ وہ خود اپنی زندگی کو بنانا نہیں چاہتی۔ وہ تمھارے ساتھ گلی گلی سرگرداں پھرنے کے لئے طیار ہے۔ وہ حقیقی معنوں میں تمھاری "شریک زندگی" بننا چاہتی ہے اس پر ترس کھاؤ اور واپس چل کر صورت حال کو بدلنے کی ایک دفعہ پھر کوشش کرو"

"ٹھہرو" مراد نے جواب دیا میری پوری بات سن لو پھر اپنی کہنا۔ آمنہ ایک فرض شناس عورت ضرور ہے لیکن ایسی حالت میں میرے ساتھ اس کے فرض کیا ہو سکتے ہیں جبکہ میں خود اپنے واجبات سے پہلوتی کر رہا ہوں۔ آمنہ کی میدنی اور سبزیاری کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ اس کا کوہا تھ بکڑنے والا نہیں ہے۔ اس کو سہارے کی ضرورت ہے اور شاہد کہنے کی اجازت دو میری امیدیں تم سے ہیں۔ تم ایسے بُرے وقت میں اس کے کام آؤ وہ گرنے چاہتی ہے۔ اسے گرنے نہ دو۔ سنبھال لو۔" مراد جس بات کا کہنا سب سے زیادہ دشوار سمجھ رہا تھا اسے نہایت کامیابی کے ساتھ کہہ گیا۔ شاہد گھبرا گیا اس کے چہرے پر رنگ آنے لگا۔ گھبرانے کی کوئی وجہ نہ مراد نے سلسلہ پھر شروع کیا میں نے جو کچھ کہا وہ بغیر سوچے سمجھے نہیں کہا ہے۔ میں اگر انسان ہوں تو تم فرشتہ در نہ تم انسان ہو اور میں ذلیل ترین کیڑا میں ہرگز آمنہ کی جان نثار یوں کا مستحق نہیں۔ میں جانتا ہوں کہ تم اس کی محبت بچپن سے کرتے رہے ہو میں نے خواجہ نثار تم کو اس سے محروم کر دیا تھا۔ جاؤ اس کا دل ہاتھ میں لو۔ وہ تم سے بھل جائیگی اور اپنی اگلی مصیبتوں کو بھول جائیگی وہ بھی تم کو دل و جان سے چاہتی رہی ہے۔ جب وہ بیاہ کر آئی ہے تو مدتوں خواب میں تم کو یاد کرتی رہی ہے۔ وہ تم سے معافی مانگا کرتی تھی۔ شاہد یہ نہ سمجھنا کہ مجھے رشک و رقابت کا احساس ہوتا تھا مجھے نہ اس کا کوئی حق تھا نہ کوئی وجہ بلکہ عکس مجھے اس خیال سے اطمینان ہوا کہ آمنہ بھی کسی کو چاہتی ہے جس کی سپردگی میں اس کو دیا جاسکتا ہے۔ اب کوئی وجہ نہیں کہ تم آمنہ کے ذمہ دار بنو۔ مختصر یہ کہ مجھ سے یہ کار سے باز گشت کی اُمید نہ رکھو۔" مراد کا دم پھولنے لگا تھا اس کی مخمور آنکھوں میں سیجاں تھا اور اب وہ چپ تھا شاہد دنگ تھا۔ اس کو خیال بھی نہ ہو سکتا تھا کہ مراد ایسے جذبات کے اظہار کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ اس کو حیرت ہو رہی تھی کہ مراد ایسی آلودگیوں میں ایسے لطیف خیالات کہاں سے پیدا کر سکا۔ شاہد کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ اب کیا کہے۔

آخر کار اس نے سوال کیا ”کیوں مراد تم اس طرح پامال و خاک بسر ہو کر اپنے کو کیوں خراب کر رہے ہو؟ کیا اب یہ ناممکن ہے کہ اس دش سے باز آؤ اور زندگی کا ایک نیا دور شروع کرو؟“

مراد کا دل اس سوال سے تڑپ گیا اور اس نے کہا ”بجائے اس کے کہ تم کو کوئی جواب دوں میں اپنی انٹیک کی زندگی پر ایک تبصرہ کرنا چاہتا ہوں۔ ہر خند کہ یہ میرے لئے ایک بڑی آزمائش کا کام ہے پہلے بہ پہلے تجربات نے بتا دیا ہے کہ دنیا میں میرے لئے کوئی دلچسپی نہیں زندگی میرے لئے ایک قید ہے زنجیر ہے کٹنے کو یوں تو محبت نے مجھے خراب کیا۔ میری افتادگیوں کی بانی ہاجرہ کی موت ہوئی مگر یقین مانو میں سیاہ دل اب اس قابل نہیں رہا کہ محبت جیسی لطیف چیز یا ہاجرہ جیسی پاک ہستی کو اپنے سے منسوب کر دوں۔ محبت اور اس کی کیفیتوں کا تصور بھی اب باقی نہیں آہ !

اس کا بھی تو اب پتہ نہیں ہے لائے تھے یہاں دل حزیں ہم

اب میں یہ کہنے کا حق تو رکھتا نہیں کہ ہاجرہ کی یاد میں اپنے کو قناکر رہا ہوں تاہم اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ جینو میں مجھے کوئی لذت نہیں ملتی۔ میں نے ہر ممکن ذریعہ آزما لیا لیکن میری طبیعت بھل نہ سکی آج کل لوگ سمجھتے ہیں کہ مجھے مینا کے ساتھ عشق ہو گیا ہے۔ لیکن اس عشق کا بہتر علم مجھی کو ہے میں اس کے ساتھ وقت ضائع کر دینا چاہتا ہوں اور بس۔ البتہ مینا کو مجھ سے شدید محبت ہو گئی ہے جس کا مجھے افسوس ہے۔ مگر دیکھئے وہ بھی مجھے گمراہیوں سے نہیں بچا سکتی۔ محبت کی قدر کرنے کی اہلیت مجھ سے چھین گئی ہے بحث کو زیادہ طول دینا نہیں چاہتا۔ ”عش نشین“ بھی اگر اتر کر آئے تو میری اصلاح نہیں ہو سکتی اس حالت میں جو کوئی مجھ سے تعلق رکھتا وہ بھی تباہ ہو جائیگا۔ چنانچہ مینا کا مستقبل مجھے اندوہناک نظر آ رہا ہے۔ لیکن اس کو بچاؤں تو کیسے بچاؤں۔ فی الحال اس سے کنارہ کش نہیں ہو سکتا اس لئے شاید تم جا کر آمنہ کے دل کو دوسری طرف متوجہ کر دو۔ میں اس کی بہبود کے لئے کچھ نہیں کر سکتا۔ اب یہ تمہارا کام ہے ہاں بریلی سے کچھ عرصہ ہوا ایک تحریر آئی تھی کہ میں آمنہ کو طلاق نامہ لکھ کر یک قلم آزاد کر دو۔ اگرچہ میں اس کو آمنہ کی کھلی ہوئی رسوائی اور توہین سمجھتا ہوں مگر سوا اس کے چارہ کار ہی کیا ہے۔ تم جاؤ میں جلد سے جلد اس کا انتظام کرتا ہوں۔ بس اب اس معاملہ میں مزید بحث کی گنجائش نہیں۔ آمنہ اور ظفر کے ساتھ میری بہترین دعائیں ہیں“ مراد نے گفتگو کو ختم کر دیا اتنے میں مینا چاروغیرہ تیار کر کے پہنچ گئی۔

شاید کی پھر بہت نہ ہوئی کہ مراد سے گھر واپس چکر آمنہ کو اپنی پناہ میں لینے کے لئے اصرار کرتا۔ مراد نے اسکی زباں بند کر دی شام کو شاید بمبئی سے ایک عجیب کشکش میں روانہ ہوا۔

(۵)

شاید کے چلے جانے کے بعد مراد کا انتشار بڑھ گیا۔ وہ سوچتا تھا کہ اور کسی قطعی فیصلہ پر نہ پہنچ پاتا تھا۔ کبھی تو آمنہ کو طلاق نامہ لکھ کر بھیجے پر

۲ مادہ ہو جاتا ہے اور کبھی خود کشی کر کے اپنی شرمناک زندگی کا خاتمہ کر لینے کی ٹھان لیتا تھا ایک ہفتہ یوں ہی گزر گیا اور اس نے کچھ نہ کیا آخر کار ایک دن اس نے مصمم ارادہ کر لیا کہ زندگی کے پاپ سے اپنے کو آج چھڑا لینگا اور اس نیت سے اس نے ایک نہایت زود اثر اور صلیک زہر مہیا بھی کر لیا رات کو حسب معمول مینا تھیٹر میں کام کرنے چلی گئی اور چلتے چلتے مراد سے کہہ گئی ”دیکھو خدا کے لئے شراب زیادہ نہ پینا اور دروازہ کھلا رکھنا میں دو بجے کے قریب آؤں گی“ مراد نے اس کے جواب میں اس کا منہ اس طرح چوما جس نے مینا کو حیرت زدہ کر دیا۔ مینا نے آج اس کے بوسہ میں ایک نئی لذت محسوس کی جس کی وہ توجیہ نہ کر سکی۔ اس کا جانے کو جی نہیں چاہتا تھا مگر ملازمت سے مجبور تھی۔

مراد نے کرہ بند کر لیا اور شراب کی بوتل سامنے رکھ کر اور ایک گلاس پی کر خود بخود کہنے لگا ”خدا کا قادر مطلق ہونا بھی انسانیت پر کتنا بڑا ظلم ہے! فطرت بھی کیسی ضدی اور خود سر ہے! انسان اس کے ہاتھ میں ایک آلہ ہے جس کو وہ جس طرح چاہے رکھے یہ ظلم نہیں تو اور کیا ہے۔۔۔۔۔! مگر نہیں خدا با فطرت محض ایک بہانہ ہے انسان اپنے ذمہ داریوں سے بھاگنے کے لئے اور اپنی کمزوریوں کو چھپانے کے لئے ایک ڈھکوسلہ پیدا کر لیا ہے میری بد نصیبیوں کا ذمہ دار خدا کیسے ہو سکتا ہے؟ میں اگر اپنی زندگی کو سدھار نہیں سکتا تو خود کشی کیوں نہیں کر لیتا۔ یہ سراسر اپنی کمزوری ہے۔ بس اب کل ہی صبح مراد کی گندی سانسوں سے پاک ہو گئی۔ آئندہ تجھے طلاق کی بھی ضرورت نہیں مراد خود آزاد ہو رہا ہے اور تجھے بھی قید سے آزاد کر رہا ہے مجھے قوی امید ہے کہ دنیا اپنی بی شمار مصروفیتوں میں تجھ کو بھلا لے گی۔ باہرہ میں تیرے گنہگار ہوں تیری محبت کو میں نے نہ جانے کیسی کسی غلاظتوں میں آلودہ کیا ہے۔ مجھے تجھ سے معافی کی توقع نہیں لیکن نہیں تو معاف کر دیگی۔ تیرا دل عفو کا گنجینہ ہے البتہ مینا کی مجھے فکر ہونی چاہئے۔ وہ جب مجھے نہ پائیگی تو اس کا کیا حال ہوگا وہ بجا رہی میری بڑی طرح گمراہ ہو گئی ہے میرے بغیر اس کا جینا محال ہو جائے گا۔ مگر دنیا میں کسی کی جگہ خالی نہیں رہتی۔ مینا کا بھی کوئی نہ کوئی ٹھکانا مل ہی آئیگا۔ میں اپنی دنیا تو اپنے ساتھ لئے جاتا ہوں۔ آئیوانی دنیا اپنا نظام آپ درست کر لیگی۔“ یہ کہہ کر اُس نے زہر کی پڑیہ جیب سے نکال لی اور ایک گلاس شراب میں گھول کر منہ تک لیگیا اور پھر ہٹا لیا۔ اس کی قوت ارادی زائل ہو چکی تھی۔ وہ آج بھی زہر نہ کھا سکا اور کچھ دیر غور کرنے کے بعد زہر آلود شراب کو پھینک دیا۔ اسی کے ساتھ اسکی آشفٹگی پھر بڑھنے لگی۔ وہی انتشار پھر شروع ہوا۔ اس نے اس کا علاج یوں کیا کہ شراب کی پوری بوتل خالی کر دی اور جا کر لیٹ رہا۔ مینا جب واپس ہوئی تو اُس نے مراد کو سوتا پایا اسکو بڑا اطمینان ہوا اس لئے کہ وجود کثرت شراب نوشی کے مراد کو بے خبری کی نیند بہت کم نصیب ہوتی تھی۔ مینا خود بھی کپڑے اتار کر سو رہی۔

سورج اپنی پوری آہ و تاب سے نکل آیا اور مراد سوتا رہا۔ چادر کا وقت گزر گیا اور مراد سوتا رہا۔ مینا نے اُس کے آرام میں خلل ڈالنا مناسب نہ سمجھا۔ لیکن جب نوبت گئے اور دفتر جانے کا وقت قریب آ گیا تو مینا نے مراد کو جگانا چاہا۔ مراد نے جنبش تک نہ کی مینا نے کھانچ کر الگ پھینک دیا۔ مراد پر کوئی اثر نہ ہوا۔ مینا نے غور سے دیکھا تو اُس کے چہرے کا عجیب رنگ تھا کئی بار نام لیکر

بکرا۔ مگر مراد نے حرکت بھی نہ کی۔ مینا کو تشویش ہونے لگی اتنے میں اُسکو معلوم ہوا کہ مراد سانس نہیں لے رہا ہے۔ مینا ایک جھج مار کر اُسکی چار پائی سے اٹھ کھڑی ہوئی اور فرش پر سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔

ڈاکٹروں نے آکر دیکھا تو پہلے اُن کو خیال ہوا کہ مراد نے زہر کھالی ہے۔ مگر لاش چیرنے کے بعد کسی قسم کے زہر کا پتہ نہ لگ سکا اور اب یہ رائے قائم کی گئی کہ موت قلب کی حرکت کے رک جانے سے واقع ہوئی۔ سبب جو کچھ بھی ہوا ہو یہ واقعہ ہے کہ مراد زندگی کی قید سے رہا ہو گیا اور مینا بے یار و مددگار ہو گئی۔

(۶)

مراد نے سچ کہا تھا کہ آمنہ کو اگر کوئی سنبھالنے والا مل جائے تو وہ سنبھل جائیگی۔ وہ مٹ اس لئے رہی تھی کہ اُس کو کوئی اُبھارنے والا نہ تھا۔ شاہد بیبی سے ارادہ کر کے چلا تھا کہ جس طرح سے بھی ہو سکے گا آمنہ کو بربادی سے بچائیگا۔ اُسکو بریلی آئے ہوئے ایک ہفتہ ہوا تھا۔ ابھی وہ سوچ رہی تھی کہ اُس کو مراد کی حیرتناک موت کی خبر ملی اس کے راستہ میں جو ممکن رکاوٹیں پیدا ہو سکتی تھیں انکا اندیشہ بھی مٹ گیا۔

مراد کی موت کا آمنہ پر جو اثر ہوا اس سے بحث نہیں اُسکو کتنا ہی بڑا صدمہ پہونچا ہو مگر اس کے اثرات دیر پا نہ تھے شاہد کی محبت ایسی نہ تھی جو آمنہ کو اپنا نہ بنا لیتی۔ رفتہ رفتہ وہ اپنی مصیبت بھولتی گئی۔ شاہد کا میا بی کے ساتھ اس کے اندر ایک نئی روح پھونک رہا تھا اور آمنہ میں زندگی کی علامتیں نمودار ہو رہی تھیں شاہد کا سب سے بڑا منتہیہ تھا کہ اُسکو آمنہ کے ظفر کے ساتھ شدید محبت تھی نتیجہ یہ ہوا کہ کچھ دن سچی اور کچھ دن رسمی سوگواری میں بسر کرنے کے بعد آمنہ شاہد کی بیوی ہو گئی اور اب یہ دونوں بہتریں معیار کی زندگی بسر کر رہے ہیں

مینا البتہ خراب ہو گئی۔ مراد کے مرنے کے بعد چند ماہ اس نے اسی مکان میں کاٹے وہ اسٹیج سے کنارہ کش ہو گئی تھی اور مراد کی ایک چیز سے اپنے دل کو تسکین دیتی تھی مگر کچھ دنوں کے بعد اس نے بمبئی چھوڑ دیا اور اب خبر نہیں کہ کہاں ہے اور کس حال میں ہے خدا جانے زندہ بھی ہے یا نہیں۔

مجنوں گورکھپوری

جناب مولانا نیاز فتحپوری یعنی جرجی زیداں کی شہور تالیف التمدن الاسلامی کے چوتھے حصے کا ترجمہ

جس میں محمد بنی امیہ و بنی عباس پر پیشل سیاسی تبصرہ کیا گیا ہے۔ قیمت صرف ۵۰

تلیخ الدولتین

دولان ولی :- دلی دکھنی کے نام سے ہر شخص واقف ہے لیکن اس کا کلام نایاب تھا اب اس کا مجموعہ ایک دلچسپ دیباچہ اور عمدہ طباعت و کتابت کے ساتھ پروفیسر کیانی۔ ایم اے نے شائع کیا ہے قیمت صرف ۵۰ (منیجر نگار نظیر آباد لکھنؤ سے طلب فرمائیے)

ہر قسم کا عطر صفر علی محمد علی تاجر عطر سے منگانا چاہئے

اکبر آئین اکبری میں

(سلسلہ ماسبق)

چونکہ ابوالفضل کی تحریر بادشاہ کے نظر سے اکثر گزرتی تھی اس لئے وہ اپنی تحریروں میں اکثر چھوٹی چھوٹی اخلاقی نصیحتیں کرتا تھا تاکہ مزاج میں سنجیدگی پیدا ہو ایسے بہت سے فقرے ہیں لیکن میں صرف ایک فقرہ درج کرتا ہوں:-

ایک دانشمند فرمانروا محض انواہ پر دھوکا نہیں کھا سکتا بلکہ دور اندیشی اور احتیاط کو پیش نظر رکھ کر مستعدی کے ساتھ ہر معاملہ کی تحقیق کرتا ہے کیونکہ سچائی کیاب اور جھوٹ عام ہے۔ اس کو لازم ہے کہ ان لوگوں کے خلاف جنہیں اس نے کسی خاص سبب سے اعزاز بخشا ہے شیمہ میں نہ پڑ جائے کیونکہ عموماً بلا سبب ایک زمانہ اداں سے عداوت رکھنے لگا تھا اور بد طینت لوگ اکثر نیکی کا جامہ پہن کر بیگناہوں کی تباہی اور پامالی کا سبب بن جاتے ہیں۔ اکبر اگرچہ جلد باز تھا پھر بھی دوستوں کے ساتھ اس کا برتاؤ سچا تھا اور اس کا وزیر ابوالفضل تو خاص طور پر مرتے دم تک اس کی مراعات سے مستفید ہوتا رہا یہاں تک کہ اس کی وفات کے بعد اکبر نے نہایت خلوص کیساتھ اس کا ماتم بھی کیا ہے۔

اکبر کے اخلاق کے متعلق ابوالفضل لکھتا ہے:-

”بادشاہ کی یہ ہمیشہ کوشش رہتی ہے کہ لوگوں کے قلوب مسخر کریں اور ان کی پاسداری فرمائیں، باوجود ہزاروں اشغال کے اس کے آئینہ خاطر پر غبار نہیں آنے پاتا بلکہ ہمیشہ شگفتہ دل رہتا ہے۔ وہ نہایت جانفشانی کے ساتھ حق کی رضا جوئی کرتا ہے اور اپنے دل کو ہر وقت دور اندیشی اور غور و خوض میں مستغرق رکھتا ہے۔ وہ ہر خورد و کلان کی بات پر کان لگاتا ہے اور کبھی ایسا موقع نہیں آنے دیتا کہ غصہ سے غضبناک ہو جائے اور بادشاہ قصہ کو مقرر کرتے ہیں تاکہ سرمایہ غنودگی حاصل ہو بر خلاف اس کے ہمارا بادشاہ انکی باتیں اس لئے سنتا ہے کہ بیدار رہے وہ اپنے اوپر ریاضت صوری و منوی دونوں لازم کئے ہوئے ہے اور اعتراضات سے بچنے کی خاطر ظاہری ارکان کی بجا آوری کرتا ہے وہ کسی مذہب کی تضحیک کرتا ہے نہ انہر زبان طنز کہوتا ہے، وہ اپنے فرائض کی بجا آوری سے غفلت نہیں کرتا وہ ہمیشہ سرگرمی کیساتھ خدا کی پاس گزاری اور اپنے اعمال کا احتساب کرتا رہتا ہے۔ وہ ہمیشہ مجروں کی جان بخشی کرتا ہے اور دل سے چاہتا ہے کہ اپنی تمام رعایا پر خوشحالی وقف کر دے بادشاہ کو چوبیس گھنٹے کے وقفہ میں ہر شخص و مرتبہ دیکھ سکتا ہے وہ اکثر چہچہہ پر کر بیٹھتا ہے اور وہیں بلا کسی اور توسط کے خود عرضیاں لیتا ہے وہ اپنی تمام رعایا پر انصاف اور آسودگی کی تقسیم خود اپنی خوشی و فرحت کے لئے نہایت ضروری جانتا ہے۔“

اس میں شک نہیں کہ اکبر کا معیار حکومت اعلیٰ درجہ کا تھا اور شاید مرس اریلیس کے سوا اکبر سے پہلے کوئی بادشاہ ایسا بلند خیال پیدا

۱۵۰ قس اریلیس پیدائش ۱۵۰۰ء وفات ۱۵۵۰ء مٹانی نس پیس کا متبنی جیسا ۱۵۵۰ء میں بجائے اسکے روم کا شہنشاہ ہوا بڑا فاضل اور زبردست فلاسفر تھا اسکی تصانیف

نہ ہوا تھا اکبر کی قوانین حکومت علی طور پر بالکل ایسے ہی ہیں جیسا کہ تیمور کے منصبہ قواعد اس نے زمین کی پیمائش کر کے اسے قسم دار قرار دیا۔ اس نے ٹیکسوں میں ترمیم کی قحط اور گرائی کے زمانہ میں جزویاً کل معاف کر دیا اُس نے کل حصری محاصل معاف کر دئے اُس نے ناپنے کی واسطے پیمانے مقرر کر دئے جن کے ذریعہ سے زمین کی مالیت اور حیثیت کا اندازہ کر دیا پھر اسپرمانگزار کی تشخیص کی ہاتھ کی بنی ہوئی چیزوں پر اُس نے نصف محصول کم کر دیا جو پانچ فیصدی رہ گیا سرکاری ملازموں کے فیس کا پیچیدہ اور غیر منصفیانہ طریقہ یا تو قطعاً موقوف کر دیا یا ان کی پیچیدگی رفع کر دی گئی ملازمین عام طور پر خزانہ شاہی سے تنخواہ پانے لگے نقشہ جات مرتب کئے گئے اور اسی لحاظ سے وہ سالہ محاصل کی تشخیص کی گئی غرض ہزاروں طریقہ سے معاملات ملکی قانونی پابندیوں سے منصبہ کئے گئے۔ مختلف حاکموں اور سراروں کے لئے جو ہدایات نافذ کی گئی تھیں ان میں سے بعض یہ ہیں :-

(نائب سلطنت) اس کو ہمیشہ رعایا کی آسودگی مد نظر رکھنی چاہئے کسی کی جاں نہ لے گا جب تک کامل غور و خوض نہ کرے دادخواہوں کو انتظار کی تکلیف نہ دیگا۔ جو لوگ تصور سے نا دم ہو کر خواستگار معافی ہوں ان کو معاف کرنا چاہئے۔ سڑکوں کو خطرات سے محفوظ رکھنا چاہئے۔ اس کو یہ اپنا فرض منصبی سمجھنا چاہئے کہ زراعت پیشہ صناعوں کا ہمدرد ہو۔

(قاضی) بلا خیال جانب داری و طمع اُسے بیدار اگر اور ستم رسیدہ میں تمیز کرنی چاہئے اور پھر اسی کی موافق عملدرآمد کرنا چاہئے۔ (کو توال) اس کو سچا، راست باز اور ایماندار ہونا چاہئے۔ اسے لازم ہے کہ بیکاروں کو کچھ تجارتی کام سیکھنے پر مجبور کرے، کم وزن سکوں کی عوض ہیک کمی کے لحاظ سے بڑھ لینا چاہئے۔ تیز شراب کے پینے سے لوگوں کو منع کرنا چاہئے۔ اس کو اس کی ضرورت نہیں ہے کہ وہ یہ معلوم کرنے کی کوشش کرے کہ لوگ چھپکر کیا کرتے ہیں وہ کسی بیوہ کو بلا اس کی دلی رغبت کے سستی نہ ہونے دیگا۔

(کلکٹر) اس کو زراعت پیشہ لوگوں کی خبر رکھنی چاہئے، اس کو کسی درمیانی شخص کی ضرورت نہ ہونی چاہئے جن کا شکاروں کو روپیہ پیشہ کی حاجت ہو قرض دے اور پھر مناسب میعاد کے اندر وصول کرے اسے عمدہ انتظامات پر انعام تقسیم کرنا چاہئے۔ اس کو یہ دیکھنا چاہئے کہ اس کا مطالبہ قرار داد سے بڑھنے نہ پائے مانگزار کی نرمی کے ساتھ وصول کرنی چاہئے۔ تکلیف دہ محاصل کا مطالبہ نہ ہونا چاہئے۔ یہ اقتباسات صرف نمونہ کے طور پر پیش کئے گئے ہیں۔ ان میں کی بعض اصل دستاویزات اب بھی موجود ہیں رہا یہ امر کہ ان پر عمل بھی ہوتا تھا یا نہیں سو اس کا یقین کرنے کے لئے کافی اسباب موجود ہیں۔ اکبر منور تیرہ برس کا تھا کہ سریر آراہی تخت سلطنت ہوا اُس وقت سے اٹھارہ برس کی عمر تک وہ اپنے اتالیق اور وزیر اعظم پیرم خان ایک بڑے معزز شریف کے زیر تربیت رہا اسی سے اکبر نے فن جنگ کی تعلیم پائی اور روزمرہ سلطنت کے معمولی کاموں کے عیب و تہر کو دیکھتا رہا۔ اس وقت کا طرز حکومت وہی تھا جو تیمور نے وضع کیا تھا۔ یہ واقعی تیمور ہی کے اصول تھے جن کی ہایوں اور بارہا ایسے دانشمند اور فیاض بادشاہوں کی بڑھاپی ہوئی شجاعت اور تربیت نے اصلاح کر دی تھی اس میں شبہ نہیں ہے کہ اکبر کے دل پر ان اصولوں پر غور و فکر کرنے سے بڑا گہرا اثر پیدا ہو گیا تھا۔ اُس نے سوچا کہ اگر اس کو ہندوستان میں حکومت کرنی ہے تو لازم ہے

کہ وہ بڑے بڑے ہندو راجاؤں سے صلح رکھے اور یہ اس وقت تک نہیں ہو سکتا تھا جب تک کہ قدیم اصول حکومت زیادہ آزادانہ سے نہ برتے جاتے اسی خیال سے اکبر نے ملکی اور مذہبی آزادی جاری رکھی اور پُرانے اصول میں بہت کچھ ترمیم و تفسیح کی۔ ممکن ہے کہ بیرخان نے اس تجویز کی تاکید نہ کی ہو لیکن ہر حال یہ یقینی ہے کہ حرم نے اس کے خلاف سازش کی۔ اٹھارویں برس اکبر نے بیرخان کو اس کی باغیانہ تحریر پاک معاف کر کے اور اس کے ساتھ نہایت فیاضانہ سلوک کر کے حج کی غرض سے مکہ معظمہ بھیج دیا اور عنان سلطنت بطور خود مختار بادشاہ کے اپنے ہاتھ میں لی جس کا آغاز ۱۵۶۵ء سے ہوتا ہے سنہ جلوس کے اٹھارویں سال ۱۵۶۳ء تک وہ بجاوٹوں کے فرد کرنے یا جدید صوبہ جات کے فتح کرنے میں مصروف رہا اور یہ سلسلہ کم و بیش اُس وقت تک جاری رہا جب تک کہ اسکے وسیع مقبوضات پر اسکی باقاعدہ حکومت نہ قائم ہو گئی یہ ابتدائی زمانہ واقعی جنگ و جدال اور فوجی کارناموں سے پر ہے۔

ابوالفضل ۱۵۶۲ء میں یعنی اکبر کی حکومت کے پہلے دور کے اختتام پر دربار شاہی میں باریاب ہوا۔ اس وقت تک اکبر اچھا خاصہ مسلمان تھا۔ زیارت کو جاتا اور بزرگان دین کی مزاروں پر طواف کرتا تھا۔ اس کی حکومت کا یہ دوسرا دور (۱۵۶۲ء سے ۱۵۶۵ء تک) اگرچہ لڑائیوں اور بجاوٹوں سے خالی نہ تھا لیکن یہ زمانہ خاص کر اس لئے قابل یادگار ہے کہ اس نے صلح کے ساتھ بہت سی فتوحات حاصل کیں۔ ایرانی لاندھیوں اور مہندوں کے ساتھ اس کا بے تعصبانہ برتاؤ خصوصاً سلطنت کے آخری زمانہ میں اس کی طرز حکومت کا ایک بڑا اگر تھا جیسا کہ ابوالفضل نے لکھا ہے کہ مذہبی ایذا رسانی اپنے مقاصد میں ناکامیاب رہتی ہے یہ انسان کو اپنی ذاتی رائے چھپانے پر مجبور کرتی ہے اور ان میں کوئی تبدیلی پیدا نہیں کرتی۔ مذہبی معاملات سے اس کی ابتدائی بے تعصبی نے بعد میں ایک عقلی مذہب کی بنیاد قائم کی جس میں اکبر نے بالکل دیساہی جیسا کہ رومن بادشاہ کیا کرتے تھے خود اپنے کو بطور اتار کے پیش کیا۔ آفتاب کو آسمانی طاقت کا مظہر مان کر بادشاہ روزانہ اسکی پرستش کرتا اور لوگ بادشاہ کو زمیں پر اس قوت کا قائم مقام سمجھ کر اس کی عبادت کرتے۔ ابوالفضل نے اکثر جگہ اس ”دین الہی“ یا ”وحدانیت“ کا جیسا کہ یہ نیا عقیدہ کہلا یا جاتا تھا حوالہ دیا ہے۔ ایک جگہ لکھتا ہے کہ:-

”انسانی تاریخ میں کوئی چیز اجرائے مذہب سے زیادہ عجیب تر نہیں ہے یہ مناسب نہیں ہے کہ ایک جدید مذہب تمام قدیم ادیان کا سختی کیساتھ بطلان کرے بلکہ موجودہ ضرورت کے مطابق ان میں رد و بدل کرنا چاہئے“ ”دین الہی“ نے اکبر کے زمانہ میں بہت مقبولیت حاصل اور اس کے جانشین کے عہد میں بھی کچھ دونوں جاری رہا لیکن زمانہ بادشاہ کی رفتار کیساتھ خود بخود اس کا بھی خاتمہ ہو گیا۔ روزانہ چار یا یعنی علی الصبح، دوپہر، مغرب اور نصف شب کے وقت بادشاہ خدا کی عبادت کرتا تھا۔ اعتدال ربیع کے قریب سال میں ایک بار بلوری شیشہ کے ذریعہ سے آگ آسمان سے حاصل کی جاتی تھی اور اس آسمانی آگ کو مناسب شخصاء کے سپردگی میں دیدیا جاتا تھا“ (ابوالفضل خود ان لوگوں کا سردار تھا) اور جب سال آخر ہو جاتا تھا تو پھر تازہ آگ حاصل کرتے تھے۔ بڑے بڑے زرین و سیمین لگنوں میں کا قوری شمعیں رات کے وقت بادشاہ کے خیمہ میں روشن ہوتی تھیں اس کے ہر کام میں اس قدر سختی کے ساتھ قاعدہ کی

پابندی ہوتی تھی کہ محل میں شعلوں کی تعداد میں چاند کی تابلیوں کیساتھ اضافہ ہوتا تھا۔ چاند رات کو آٹھ ٹھیلے روشن ہوتے تھے اور چوتھی سے دسویں تا یح تک ہر رات میں ایک کم کر کے روشن ہوتے تھے تاکہ دسویں کو صرف ایک کافی رہے اور اسی طرح ہمیشہ چاندنی راتوں میں ہوا کرتا تھا۔ تیل اور پرانے کپڑے کی ٹھیک مقدار جو ہر فقیلہ کے لئے دی جاتی تھی بیان کی گئی ہے۔ پھر ابوالفضل روحانی ہدایت کے متعلق لکھتا ہے کہ ”خدا نے انسان کی فطرت یہ رکھی ہے کہ وہ اپنے کام کی تعریف کرتا ہے اور دوسرے کے کاموں میں عیب نکالتا ہے، اس طرح مختلف لوگ مختلف عقیدے رکھتے ہیں اور اپنے اپنے خیالات و تاویلات میں مست رہتے ہیں“ لیکن ایک وقت آتا ہے کہ انسان پر حق کا ظہور ہو جاتا ہے جب کوئی معمولی عام آدمی علم کے اس درجہ تک پہنچ جاتا ہے تو وہ آدمیوں کے خوف سے سکوت اختیار کرے رہتا ہے اور جب یہ نور کسی بادشاہ کو عطا ہوتا ہے جیسا کہ اکبر کو عطا ہوا تھا وہ موقع زبان کھولنے کا ہے۔ پھر بھی شہر یار نے کچھ عرصہ تک اپنے اس اسرار پر پردہ ڈالا تاکہ بیگانوں کو اس علم نہ ہونے پاوے آخر کار اس نے اپنی ملکوتی صفات کا اعلان کیا اور اس کی روحانی کرامات کا مختلف طور پر اظہار کیا کیا۔ جو لوگ اسکی صحبت میں رہے ان کے علم میں ترقی ہوئی غریبا اور حاجتمند اس سے محبت کرنے لگے اس نے پیشینگوئیاں کیں اور امراض کا دغیہ بھی کیا، بادشاہ موقع اور محل پر دوسرے لوگوں کو بھی ہدایت کرتا ہے اور اکثر آدمی اپنی قابلیت کے لحاظ سے اسکی عمدہ تقریروں سے محفوظ ہوتے ہیں، آگے چل کر ابوالفضل لکھتا ہے ”یہ مناسب موقع نہیں ہے کہ ان طریقوں کی پوری تفصیل بیاں کی جائے جس سے بادشاہ لوگوں کو ہدایت کرتا ہے ورنہ بہت سے خوارق عادات بیاں کئے جاسکتے ہیں جو اس سے صادر ہوئے اگر میری زندگی نے کافی مہلت دی اور زمانہ نے فرصت دی تو میرا ارادہ ہے کہ میں ایک دفتر اس دیکھپ عنوان پر تصنیف کر دوں گا“

ظاہر ہے کہ نیک مزاج ابوالفضل اپنے اس موعودہ تصنیف کو ملتوی کرنے پر مجبور تھا اور یہ بھی عیاں ہے کہ ”دین الہی“ میں درحقیقت اصلی روحانیت نام کو نہ تھی۔ اس مذہب کی بنیاد زیادہ تر دلائل پر مبنی تھی۔ کوئی زبردست خرق عادت اور ظاہری علامت ایسی نہ تھی جس پر بھروسہ کیا جاتا۔ جو خرق عادات ”اکبر کی طرف منسوب کیا گیا ہے وہ بہت معمولی ہے اس نے لکھا ہے عقیدہ اس چیز کا نام ہے جو بیچ نہ ہو۔“ اکبر نے اپنے ہم مشرب لوگوں سے پورے طور پر ان کے عقاید کا احتساب نہیں کیا۔ وہ اس کی مرضی کے دلدادہ تھے اور اس کے مراعات سے علانیہ فائدہ اٹھاتے تھے اور اس کے منصفانہ اور عادلانہ حکومت میں خوشحال تھے۔ شاہی مذہب اکبر کی سرپرستی سے اس کے بعد اس کے جانشین کے عہد میں قائم رہا لیکن خود بادشاہوں نے اس پر کم توجہ کی اور جیوٹ فرقہ کے عیسائیوں اور مسلمان ملاؤں کو اجازت دی کہ دان کے رد و مباحثہ کریں اور مذہبی اعتقاد کا فیصلہ جہانی قوت پر منحصر کیا۔

ابوالفضل نے کشمیر کے ایک مندر کے لئے جو کتبہ تحریر کیا اس میں اکبر کی بے تعصبی کو نہایت خوبی کے ساتھ مختصر الفاظ میں بیان کیا ہے لکھتا ہے۔ (اس صفحہ کا نوٹ صفحہ ۷۲ میں درج ہے)

اے میرے خدا میں ہر معبد میں ان لوگوں کو دیکھتا ہوں جو جھکو دیکھتے ہیں اور ہر ایک زبان میں جو میں سنتا ہوں لوگ تیری حمد کرتے ہیں۔ شرک اور اسلام دونوں تیرے ہی جستجو میں ہیں ہر مذہب ہی کہتا ہے کہ تو واحد ہے اور بے ہمتا ہے۔ مسجد میں تیری ہی نماز پڑھی جاتی ہے اور عیسائی کلیسہ میں تیری ہی محبت میں گھنٹے بجاتے ہیں۔

کبھی میں کلیسا میں جا نکلتا ہوں کبھی مسجد میں جا کھڑا ہوتا ہوں مگر جہاں جاتا ہوں تیرے ہی تلاش میں ایک معبد سے دوسرے معبد میں جاتا ہوں۔ تیرے مقبول بندوں کو نہ مذہب سے مطلب نہ بیدینی سے غصہ کیونکہ تیرے جمال عکس سے دونوں میں کوئی بھی محروم نہیں ہے بلکہ کو الٰہ و مبارک، مومن کو ایمان مبارک، مگر آخر کار گلاب کی پتی عطا کے دل سے متعلق ہے۔

شہنشاہ جہانگیر اپنی تزک میں اپنے باپ اکبر کے حالات یوں بیان کرتا ہے:-

”والد بزرگوار بہر عقیدہ کے علماء سے گفتگو کیا کرتے تھے اور اگرچہ وہ خود کچھ پڑھے نہ تھے تاہم ہمیشہ علماء اور طباع لوگوں سے بات چیت کرتے کرتے ان کی زبان ایسی شستہ ہو گئی تھی کہ کوئی شخص ان کی گفتگو سے یہ تمیز نہیں کر سکتا تھا کہ وہ تعلیم یافتہ نہ تھے وہ نظم اور نثر دونوں کی لطافت کو ایسا اچھا سمجھتے تھے کہ ان پر کبھی کسی اور کو ترجیح دینا ناممکن ہے۔“ میں نے اس بیان کو کئی بار پڑھا ہے اور میں اس قطعی جہالت کا اس کی اعلیٰ درجہ کی تنقید نہ قابلیت سے مطابقت کرنے میں ہمیشہ کامیاب رہا۔ اکبر اپنے بچپن کا زمانہ جو خطرات، حوادث، اور انقلابات سے پر تھا گزار کر تیرہ برس کی عمر میں تخت نشین ہوا۔ میری بچی معصوم کی تاریخ کے ایک فقرہ سے (جس کا اردو کا سن جلوس کے دوسرے سال بطور معلم کے منتخب ہوا تھا) یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اس وقت تک شاہزادہ کچھ لکھنا پڑھنا نہ جانتا تھا۔ ”اس وقت تک“ کا فقرہ اس امر پر دلالت کرتا ہے کہ وہ بعد میں پڑھ لکھ گیا تھا۔ اور جہانگیر کے بیان کا مطلب بھی شاید اس سے زیادہ نہ ہو گا کہ اس کے باپ کی تعلیم بچپن کے زمانہ میں کچھ نہ ہوئی تھی جو ہایوں کے آخری زمانہ کے تکلیفات کے لحاظ سے تعجب خیز نہیں ہے میر عبد اللطیف اکبر کا پہلا معلم تھا۔ سولہویں برس کی عمر میں اکبر کے لئے ایک دوسرا معلم مقرر ہوا جس سے اس نے وہ نظمیں پڑھیں جنہیں تصوف کے اصطلاحات تھے۔

(یہ نوٹ صفحہ ۱۷۷ کا ہے) اے محمد عسکری حسینی بلگرامی نے در المنثور میں اس کی نقل کی ہے وہوذا ”ایسی بر خانہ کہ می نگرم جو یای تواند و بر زبان کہ می شنوم گویای تو۔ کفر و اسلام در بہت پویان + وحدہ لا شریک لہ گویان + اگر مسجد است بیا تو نعرہ قدوس میزنند اگر کلیسا است بشوق تو تا قوس می جنبانند کہ معتکف دیرم و گہ ساکن مسجد + یعنی کہ ترامی طلبم خانہ بجانہ + اگر خاصان ترا کفر و اسلام کارے نیست این ہر دورا در پردہ اسلام تو بارے نہ + کفر کا ذرا دویں دینا دوزا + ذرہ ردی دل عطار را + این خانہ بہ نیست اتیان قلوب موحداں ہندوستان و خصوصاً معبود پرستان عرصہ کثیر تعمیر یافتہ + بفرمان خدیو تخت و سیر + چراغ آفرینش شاہ اکبر + نظام اعتدال ہفت معدن + کمال اتساع چار عنصر + ہر کہ نظر صدق نینداختہ این خانہ را خراب بازو باید کہ نخست معبد خود را بنید اندوچہ اگر نظر بردل است با ہمہ ساختی است و اگر چشم بر آب و گلی است ہمہ بر انداختنی۔ بیت

خانہ نام نہاد کا کہ نہتہ سے نہتہ آگاہ بہ پیشرو شاہ دہلی بیت شاہ

تاریخ کا ایک گمشدہ ورق

(زبیدہ)

جب شہ ۷ میں جنگ زاب نے حکومت بنی امیہ کا شیرازہ بالکل منتشر کر دیا اور بنو عباس کی طرف سے ابو مسلم خراسانی کی تلوار خاندان بنی امیہ کے سروں پر چکنے لگی، تاکہ ان کے ہر ہر فرد کے وجود سے دنیا کو پاک کر دیا جائے، تو ان متمردگان دولت حکومت میں سے ایک شخص اُس سے بچ کر نکلنے والا بھی تھا جس نے بنو عباس کے تمام آرزوؤں کو خاک میں ملا دیا اور اندلس پہنچ کر ایک ایسی زبردست حکومت اسلامی قائم کی جس پر خاندان عباس نے ہمیشہ رشک کیا اس شخص کا نام عبدالرحمن الداخل تھا۔

اس وقت کا موضوع سخن یہ نہیں کہ عبدالرحمن کے اُن واقعات حیات سے بحث کی جائے جو تاریخ میں موجود ہیں اور نہ یہ بتانا مقصود ہے کہ اس نے کیونکر اندلس میں دولت اسلامی قائم کی اور بلا دغوب میں اس کی ذات سے علم و ادب کو کس قدر فائدہ پہونچا کیونکہ اس کی تفصیل تمام تاریخی کتابوں میں ملتی ہے، بلکہ مقصود اس واقعہ کو بیان کرنا ہے جسے مؤرخین نے ترک کر دیا یعنی یہ کہ کس طرح اس نے موت سے نجات پائی اور کیونکر بنی عباس کے نتیجہ سے آزاد ہونے میں کامیاب ہوا۔

جس وقت بنو عباس، خاندان بنی امیہ کی گرفتاری میں مصروف تھے، اُس وقت عبدالرحمن نہ فرات کو عبور کر کے اپنے چھوٹے بھائی کے ایک چھوٹے گانوں میں پہونچا اور یہاں ایک ایسے شخص کے مکان میں پناہ گزین ہو گیا جو اس خاندان کا ممنوں احسان تھا اس کے ایک لڑکی تھی زبیدہ نہایت جمیل و خوش اندام جس کی عمر ابھی صرف ۱۶ سال کی تھی جو اپنے باپ کے غیر حاضری میں رجب وہ فرات میں مچھلی کے شکار کے لئے جاتا (گھر کا سارا انتظام کرتی۔ عبدالرحمن کی عمر بھی اس وقت ۲۰ سال کی تھی اور یہ بھی نہایت خوبصورت اور دلکش نقشہ کا انسان تھا۔

اول دن جب زبیدہ کی نگاہ اس پر پڑی تھی، اس کے دل میں عبدالرحمن کی محبت پیدا ہو گئی تھی لیکن اب کچھ زمانہ کے قیام نے اس جذبہ میں اور زیادہ استحکام پیدا کر دیا تھا۔ وہ نقاب کے نیچے سے، پردہ کی اوٹ سے، دریچوں کی جھلملی سے اسے دیکھا کرتی تھی اور خاموشی کے ساتھ مہرج محبت طے کرتی جاتی تھی۔

ایک دن زبیدہ پانی لینے کیلئے دریاے فرات کے کنارے گئی تو بائیں ساحل کی طرف دور کی فضا میں بہت سے سیاہ پرچم اُس کو متحرک نظر آئے وہ جانتی تھی کہ سیاہ پرچم بنو عباس کا قومی نشان ہے، وہ اس سے بھی واقف تھی کہ عباس کی اولاد بنو امیہ کی جانی دشمن ہے اور اس کا مہمان (عبدالرحمن) خاندان امیہ کا ایک فرد ہے۔ یہ دیکھ کر اس کا جی دہل گیا اور وہ سمجھ گئی کہ اب عبدالرحمن

کی خبر نہیں ہے، اس لئے وہ فوراً گھر گئی تاکہ اپنے باپ سے سارا ماجرا بیان کرے، لیکن اس وقت وہ بھی نہ ملا اب سوائے اس کے کوئی چارہ کار نہ تھا کہ وہ براہ راست عبدالرحمن کو اس خطرہ سے آگاہ کرے۔ اس حد تک تو اس کے خیالات کی رفتار عام فطرت انسانی کے ماتحت عمل میں آئی، لیکن اس کے بعد ہی اُس کے جذبات محبت و الفت جنبش میں آئے اور اس نے خیال کیا کہ عبدالرحمن کو خطرہ سے آگاہ کرنا گویا اپنے سے جدا کر دینا ہے اور اس کو وہ گوارا نہ کر سکتی تھی اس لئے اس کی محبت حیلہ کارنے — اور کونسی محبت ہے جو حیلہ کار نہیں ہوتی۔ یہ تدبیر نکالی کہ مردانہ لباس پہن کر اس کے پاس جائے اس خطرہ سے آگاہ کرے اور خود بھی اس کیساتھ رہبر کے حیثیت سے ساتھ ہو، چونکہ عبدالرحمن نے اس وقت تک زبیدہ کی صورت نہ دیکھی تھی اس لئے یہ تدبیر اس کی بالکل ممکن العمل تھی۔

زبیدہ نے اپنے باپ کا لباس پہنا اور دروازہ کھٹکھٹا کر عبدالرحمن سے سارا حال بیان کیا۔ اول اول اُس نے پس و پیش کیا کہ چھوٹے بھائی کی مصیبت میں کیونکر وہ بھاگ سکتا ہے، لیکن جب زبیدہ نے مجبور کیا اور خدمات رہبری میں پیش کیں تو عبدالرحمن راضی ہو گیا اور آخر کار یہ مینوں غروب آفتاب سے قبل فرات میں کودے تاکہ اُس کو عبور کر کے نکل جائیں اس کشتی میں عبدالرحمن کا چھوٹا بھائی دریا کے اندر ڈوب گیا۔ کہا جاتا ہے کہ عباسیوں کے ایک تیرنے اسکو زخمی کر دیا تھا جس سے وہ جانبر نہ ہو سکا اور دریا میں غرق ہو گیا۔ بہر حال وہ عباسی لشکر کے تیرے زخمی ہو کر مرا ہوا کسی اور حصے سے یہ واقعہ ہے کہ فرات کے دوسرے ساحل پر جب وقت عبدالرحمن پہونچا تو صرف رہبر اس کے ساتھ تھا اور اس کا چھوٹا بھائی اس سے ہمیشہ کیلئے جدا ہو چکا تھا۔

یہ دونوں چوروں کی طرح چھپتے چھپاتے شام، جبل بسان، فلسطین، صحرائے سینا سے گزرتے ہوئے مصر کی حدود میں داخل ہوئے اور قیروان تک پہونچ گئے عباسیوں کی طرف سے مصر میں جو حاکم مقرر تھا اس کو بھی عبدالرحمن کی فراری کی خبر دیدی گئی تھی اور وہ بھی جستجو میں تھا، لیکن عبدالرحمن مع زبیدہ اور ایک خادم کہ جس کا نام بدر تھا اور جو مصر سے ساتھ ہو گیا تھا، اندلس پہونچا اس وقت یہاں کی حالت یہ تھی کہ نہ صرف ہمدرد اور غریبوں میں سیادت کی نزاع قائم تھی بلکہ خود عربوں کے اندر بھی مفری اور یمنی کی تفریق نے سارے ملک کے اندر اضطراب پیدا کر رکھا تھا۔ اس انشقاق و بد امنی سے فائدہ اٹھا کر عبدالرحمن حکومت بنی امیہ کے لئے لوگوں کو دعوت دینی شروع کی اور آخر کار ستمبر ۷۵۵ء میں وہ بنو امیہ کا قائم مقام ہو کر یہاں کا حکمراں ہو گیا اُس نے قرطبہ میں نیا قلعہ طیار کرایا۔ مسجد بنوائی اور خطبہ سے منصور خلیفہ عباسی کا نام نکال کر اپنا نام داخل کیا۔ اسی عہد سے عبدالرحمن داخل (اول) کے لقب سے مشہور ہوا اور تاریخ میں اپنی بیشمار یادگار چھوڑ گیا۔

حکومت و دولت کے زمانے میں بھی عبدالرحمن نے اپنے شریک مصائب (زبیدہ) کو فراموش نہیں کیا اور اس کو کوئی جلیل القدر

خدمت تفویض کرنی چاہی کیونکہ وہ اب تک اسے مردہ ہی سمجھا تھا۔ لیکن جب ایک دن وہ اپنا مردانہ لباس اتار کر عبد الرحمن کے سامنے آئی تو اسے سخت حیرت ہوئی، لیکن اب بھی وہ یہ نہ سمجھ سکا کہ اس نے اس قدر تکلیفیں کیوں برداشت کی تھیں اور اس کے دل میں کس قسم کی آگ مشتعل تھی۔ عبد الرحمن الداخل جو سلطنت و سیادت تمام دقیق ترین رازوں سے آگاہ تھا جو حکومت و قیادت کے نازک ترین نکات کے سمجھنے میں اس قدر ذہین و ذکی تھا، وہ ایک لمحہ کے لئے بھی زبیدہ کی حالت کا اندازہ کرنے میں کامیاب نہ ہوا اور اس کے چہرہ میں جو کھلا ہوا صحیفہ محبت و عشق تھا، اس کے ایک جذبہ کا بھی مطالعہ نہ کر سکا۔ عبد الرحمن کی ساری زندگی میں غالباً ہی ایک واقعہ ایسا ہے جس سے اس کی بے حسی اور بلا دت ذہن کا پتہ چلتا ہے۔ عبد الرحمن نے زبیدہ کی انتہائی عورت کی تمام امرا کے سامنے اُسے ”فارسل جمیل“ کا لقب عنایت کیا۔ لیکن زبیدہ کا اپنے وطن و دہرہ کو ترک کرنا، تمام مصائب برداشت کرنا اس غرض سے نہ تھا کہ وہ جاہ و شہرت کی طالب تھی بلکہ اس نے یہ تمام آلام اس بنا پر جھیلے تھے کہ وہ ایک دن اپنے محبوب سے مل جائے گی، اس لئے جب اُس نے عبد الرحمن کے قلب کو اس درجہ بار ورجے جس پایا تو اس کا مایوس ہو کر حزیں و ملول ہو جانا بالکل فطری امر تھا لیکن عبد الرحمن جو انتظام مملکت کے اہم مشاغل میں مصروف رہتا تھا اس کو کیا اس امر کا موقع مل سکتا تھا کہ زبیدہ کے نازک حیات کو سمجھتا۔

ایک زمانہ اسی طرح گزر گیا یہاں تک کہ چند دنوں کے لئے اطمینان سے بیٹھنے کی فرصت اسے نصیب ہوئی۔ وہ ایک دن محل کے معاملات پر غور کر رہا تھا کہ دفعۃً اُسے زبیدہ کا خیال پیدا ہوا اور اُس نے ارادہ کیا کہ کسی سردار سے اس کا عقد کر دینا چاہئے چنانچہ اس نے سر عسکر عبد الملک کو طلب کیا اور اس کی رضا مندی حاصل کر کے زبیدہ سے دریافت کیا کہ اسے تو کوئی عذر نہیں ہے۔ زبیدہ اس کے قدموں پر گر پڑی اور باجٹم پر غم بولی کہ ”آپ مالک و مختار ہیں، میں کیا اور میری رائے کیا“

جشن زفاف کا اہتمام کیا جائے، چنانچہ اس حکم کی تعمیل ہوئی اور سارا قریبہ اس خوشی میں چہرا غان کیا گیا۔ لیکن جس وقت زبیدہ کے حجرہ میں پہنچے تو وہ وہاں موجود نہ تھی بلکہ عبد الرحمن کے حجرہ میں پڑی ہوئی رو رہی تھی عبد الرحمن کو اطلاع ہوئی تو وہ خود وہاں گیا۔ لیکن یہ وہ وقت تھا جب زبیدہ سکر ات موت میں مبتلا تھی۔

جب زبیدہ نے نگاہِ واپس میں سے عبدالرحمن کو دیکھا تو اس کی آنکھوں سے بھی حجاب اٹھا اور اب سمجھ میں آیا کہ زبیدہ کا تمام آلام و مصائب اختیار کرنا کس لئے تھا۔ لیکن یہ سمجھنا اب بعد از وقت تھا کیونکہ موت کی زردی اس کی پیشانی پر دوڑ چکی تھی۔

زبیدہ نے اپنی آخری نگاہ اٹھائی اور کچھ گفتگو بھی کی جس سے عبد الرحمن صرف اس قدر سمجھ سکا کہ اس نے زہر کھا لیا۔

اس نے زبیدہ کو اپنے ہاتھوں پر سنبھالا اور سینہ سے لگا کر آخر کار اس کو اس جگہ دم توڑنے کی اجازت دیتی ہی پڑی جہاں تک پہنچنے کی تمنائیں وہ ساری عمر گھلائی۔ عبدالرحمن نے اسی عبدالرحمن نے جوشیون مملکت کا انتظام تو کر سکتا تھا لیکن ایک قلب مجروح کا مداوا اس کے اختیار میں نہ تھا، زبیدہ کی سر و پیشانی کو بوسہ دیا، اور روتا ہوا حجرہ سے باہر نکل آیا۔

یادہ ناب مجموعہ رباعیات فارسی میردلی اللہ صاحب بی اے عمر
مطالبہ فطرت - (مجلد) اتحاد فلسفہ اسلام پر ایک نمائندہ تصنیف - مصنفہ محمد فاروق ایم۔ ایس۔ سی عمر
شکد ان فصاحت - عربی فارسی اردو کے بہترین علمی ادبی تاریخی لطائف کا مجموعہ عمر
تذکرہ حضرت بلھے شاہ - پنجاب کے نہایت مشہور بزرگ کے تاریخی حالات مستند ذرائع سے ۸
جہاں آرا بیگم - شاہزادی جہاں آرا بنت شاہجہاں کی نہایت مستند و دلچسپ تایخ ۸
سندگی - امام ابن تیمیہ کی مشہور کتاب "العبودیت" کا بمثل ترجمہ حقائق دینی و تصوف کی بے نظیر کتاب عمر
لسان الغیب - حافظ شیرازی کی مکمل سوانح عمری اور ان کے دیوان کی بہترین شرح جلد اول سے جلد دوم عک
فتنہ خلق قرآن - امام عبدالعزیز بن کبیر کی کتاب "الجبیدہ" کا ترجمہ مسئلہ قرآن کے متعلق ایک بے نظیر محاکمہ ۱۰
کاس الکرام - عمر خیام کے مفصل حالات زندگی، اور رباعیات کی مکمل شرح، اس موضوع پر پہلی کتاب ہے۔ سے
یادگار غالب - مرتبہ شمس العلماء خواجہ الطاف حسین حالی پانی پتی سے
کلیات نظم حالی - مرتبہ شمس العلماء حالی کے تمام منظوم کلام کا مکمل مجموعہ عمر
نقش ارژنگ - جلال الدین صاحب اکبر کی نظموں اور غزلوں کا مجموعہ عمر
ابو مسلم خراسانی - جرجی زیدان مصری کے مشہور ناول کا اردو ترجمہ عک
الفاروق - مکمل ہر دو حصہ مع نقشہ دنیا کے اسلام، علامہ شبلی کی سیرت حضرت عمر رضی اللہ عنہ پر مشہور کتاب ہے عمر
اصلاح سخن - تربیت موضوع کے لحاظ سے اردو میں پہلی کتاب جس میں جناب شوق سدیوی نے اپنی چند غزلوں کو مع ان تمام اصلاحوں کے یکجا کر دیا ہے۔ قیمت صرف سے
فغان آرزو - جناب سید انور حسین آرزو لکھنؤ کے مشہور شاعر کا مجموعہ کلام مع محصول ڈاک عک
مینجر نگار نظیر آباد لکھنؤ

حالی اور شاعری

مولانا حالی کی ذات اردو دنیا میں ہر تعارف سے مستغنی ہے۔ ان کی نئی اصلاحیں اور علمی کارناموں نے لوگوں کے سامنے ایک ایسی نئی دنیا پیش کر دی جس نے ہر ایک کو اپنی طرف متوجہ کر لیا دیکھنے والوں نے دیکھا اور محو حیرت ہو گئے سننے والوں نے سنا اور خیالات کی داد دینے لگے نصیحتیں گو ترش تھیں مگر ہر ایک کو سمجھ کر فائدہ مند خیال کرنے لگا اور غالباً مولانا نے یہی سمجھ کر یہ نیا راستہ اختیار بھی کیا تھا جس میں ان کو ایک بڑی حد تک کامیابی بھی ہوئی ورنہ اردو والوں کے کان تو کسی اور قسم کے کلام سننے کے عادی تھے ایسی خشک باتوں کی طرف کب مائل ہوتے۔

مولانا کے لئے اردو شاعری کی قدیم شاہراہ کو چھوڑ کر مولانا محمد حسین آزاد کے ایجاد کردہ راستہ پر قدم رکھنے کے کئی وجوہ تھے اپنی طبیعت میں متانت۔ تقدس اور دور اندیشی وہ فطرت ہی سے نہ صرف منع کیا بلکہ دوسری منزل کی طرف رخ کرنے پر مجبور کیا۔ دوسری خاص وجہ جس نے انکی طبیعت میں انقلاب پیدا کر دیا۔ وہ ان لوگوں کی صحبت تھی جو اس وقت کی اردو شاعری سے گھبرا کر ترمیم کیسا تھے اس کو راہ راست پر دیکھنے کے متمنی تھے۔ علاوہ اس کے اسلام کی روز افزوں پستی نے ان کو اس قدر متاثر کر دیا تھا کہ بچپن ہو اس کی حالت کے سدھارنے کی فکر کرنے لگے۔

اپنے پیام کو ملک و قوم تک پہنچانے کے لئے شاعری کو وسیلہ اظہار خیالات بنا کر ہر ادارہ نصیحت کرتے رہے غرض کہ اپنے ماحول کی کیفیات سے متاثر ہو کر اپنی ذہنی تبدیلی ہی لازمی سمجھی اور نئے اصول پر کار بند ہوئے۔

مولانا حالی نے اپنے وقت کی اردو دہ شاعری جس کا مرقع انھوں نے خود کیسے قدر مبالغہ کے ساتھ پیش کیا ہے واقعی اسی قابل تھی کہ اس سے کنارہ کسی اختیار کی جائے داجد علی شاہی عیش و سرمے نے اس قدر لوگوں کے دل و دماغ پر غلبہ کر لیا تھا کہ قریب قریب متانت اور سنجیدگی اردو شاعری کے لئے گم نام ہو گئی تھی۔ بو الہوسی اور مکر دہات کی تصویر ایسی عیاں پیش کی جاتی تھی کہ الحذر۔ لوگ اس طرح سے جال میں پھنس گئے تھے کہ نکلنا مشکل ہو گیا تھا۔ اس کا اثر یہ تھا کہ کلام میں جو جو اہر ات ہوتے بھی تھے وہ نظر نہ آتے تھے دیکھنے والے کو یہ ملاحظہ ہوتا تھا کہ اردو شاعری میں بجز خرافات کے اور کچھ بھی نہیں۔

ایک طرف تو قوم کی ناگفتہ بہ حالت دوسری طرف ادب کی یہ گت دونوں کے سنبھالنے کے لئے اپنے نئے اصول کی شاعری سے دونوں کی اصلاح بیک وقت و بیک کر شتمہ مناسب سمجھا اور بالکل صحیح سمجھا چنانچہ ان کا سارا کلام ایک نئے اصول پر مبنی ہے۔ خیالات پرانی شاعری سے بالکل جدا ہیں مبتذل الفاظ اور پست خیالات قریب قریب بالکل مفقود ہیں مایہ نون ہونے کی حیثیت سے

صفر علی محمد علی تاجر عطر لکھنؤ سے ہر قسم کا عطر خرید کرنا چاہئے

مولانا نے اپنے اشعار میں خامی کہیں سے نہیں پیدا ہونے دی۔ بندشیں سب اپنی جگہ پر چبھت ہیں جو مضمون نظم کیا نہایت پختگی کے ساتھ زبان چونکہ نکسالی ہے لہذا محاورات اور دوزمرہ میں بھی کہیں سے خلل پیدا نہیں ہونے پاتا۔

مرزیاں نہایت سیدھا سادا اپنے پیچیدہ مضامین کو بھی نہایت سہل اور صاف کر کے کہنے کی کوشش کی ہے تاکہ کلام عام فہم ہو جائے۔ حالانکہ شاگرد میرزا غالب کے تھے مگر مرزا ادا اور زبان جدا ہیں۔ مولانا حالی بھی فارسی ترکیبیں صرف کرتے ہیں مگر اس قدر نہیں جتنی کہ میرزا غالب مرحوم۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ اپنے استاد سے ایک بات میں بڑھ گئے ہیں عربی فقرات کی تصرفات مولانا کے یہاں مرزا غالب کے یہاں سے نسبتاً بہت زیادہ ہیں کہیں پر تو پورے پورے مصرعے نظم ہو گئے ہیں اور کہیں کہیں صرف فقرے درمیاں شعر میں آگئے ہیں۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔

میں اور اطاعت یزید گمراہ نو لا حول ولا قوت الا با شہر

ہے فقیہوں میں اور ہم ہیں نزاع حل نہ فی نزاعنا من قاض

ایک جگہ نعت میں فرماتے ہیں۔

تجھ سے ہوئی زندہ خلق جیسی کہ باراں سے خاک خلقک خضب الزمان بعشک میا الوری

ایک غزل میں ہے۔

دوزخ ہے گرد وسیع تو رحمت وسیع تر لا تقطع جواب ہے ہل من حوید کا

اسی عنوان سے کہیں کہیں نامانوس عربی ترکیبیں اور ثقیل الفاظ بھی آگئے ہیں مثلاً۔

تعرف الاسیاء بالاضداد عند الفحول

اسی طرح کہیں کہیں اپنے منتر کی طرح نظم میں بھی بے ساختہ انگریزی الفاظ استعمال کر گئے ہیں مثلاً

Republic, Liberal, Liberty, Reformer English

Nation. Good, Subject.

یہ چند باتیں بیشک ایسی ہیں جو زبان پر گراں بار ہیں ورنہ اس کے علاوہ جہاں تک زبان کا تعلق ہے صفائی اور سلاست بہت کافی موجود ہیں

مولانا نے گل و بلبل کا کوچہ نہایت تنگ بچھا فرضی عاشق معشوق کے واردات، بے بنیاد ہجر و صل کے قصے بے معنی، شکوہ و گلہ

مضامین

خیالی شراب و ساقی کی داستانیں، بار بار مرنے اور پھر جینا، یہ سب لایعنی بیکار اور ان کو اپنے لئے باعث تنگ و عار نظر

آئے۔ اردو ادب کی اس گمراہی کو وہ نہایت تاسف کی نگاہوں سے دیکھا کئے ان کے خیالات و بیانات سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کو

سخت گھبراہٹ تھی کہ اردو کہاں سے کہاں جا پڑی ہے (ببین تفاوت رہ از کجا است تا کجا) ایسی خرابیوں کو دور کرنے کے لئے مولانا نے

اپنے کلام کو قوم و ملک کے سامنے نمونہ بنا کر پیش کر دیا جس میں وسیع انخیال ہونے کے لحاظ سے انھوں نے توحید فلسفہ تصوف، انسانی فرائض اخلاقیات نصائح اور قومی درد جز وغیرہ کو کافی جگہ دی ہے ان کے کلام کا بیشتر حصہ قومی نظموں سے معمور ہے۔ اور جس میں قومیت کی جہلک ہے وہ ہر لحاظ سے قابل قدر ہے۔ مولانا کے دوسرے خیالات کے مقابلہ میں یہ کلام زیادہ پرورد اور دل پذیر ہے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے دل کو مسلمانوں کی غیر معمولی زوال نے اس قدر متاثر کر دیا تھا کہ بجائے آنسوؤں کے آنکھوں سے خوں ٹپکتا ہے۔ جو بات اسلام کے متعلق کہتے تھے اس میں اس قدر اثر ہوتا تھا کہ فوراً کیفیت طاری ہو جاتی تھی یہی وجہ تھی کہ ان کی اور نظموں سے زیادہ ان کی مسدس مقبول عام ہوئی۔ ہر تعلیم یافتہ مسلمان کے زباں پر اس کے مصرع اب تک جاری ہیں قومی جلسوں اور میلادوں میں بھی مولانا کا کلام تبرکاً اور عبرتاً پڑھا جاتا ہے۔ اس میں مولانا نے نہ صرف زور تخیل اور افسانوں پر بنیاد رکھ کر اسلام کی مبنی کو دکھایا ہے بلکہ تاریخی واقعات سے بھی کام لیا ہے۔

اسلام کی گزشتہ عظمت دکھانے کے بعد مولانا نے موجودہ زوال کو خود دیکھ رہے تھے بیان کیا ہے بیان کرتے کرتے ایک بار ان کا دل بھر آتا ہے اور بے ساختہ کہہ دیتے ہیں :-

بستی کا کوئی حد سے گزرنا دیکھے اسلام کا گر کر نہ ابھرنا دیکھے

مانے نہ کبھی کہ مدھے ہر جزا کے بعد دریا کا ہمارے جوا ترنا دیکھے

ہمارے خیال سے یہ تنگ نظری ہوگی اگر یہ کہا جائے کہ مولانا کی شاعری محض مسلمانوں ہی تک محدود تھی اس لئے کہ ان کے کلام کا ایک بڑا حصہ ایسا بھی ہے جو ہر مذہب و ملت کے لئے یکساں کارآمد اور سبق آموز ہے ان کی تعلیم دنیا میں رہنے کی اور اس کی عزت حاصل کرنے کی مصرع

صلائے عام ہے یا راہِ نکتہ داں کے لئے

ان کے الفاظ اور معنی سے یہ جہلک کہیں نہیں پیدا ہوتی کہ دوسری قوموں کو تنفر اور حقارت کی نگاہوں سے دیکھا جائے لہذا ملک صلح کل ہے چنانچہ ایک جگہ فرماتے ہیں :-

ہندو سے لڑیں نہ گھر سے بیر کریں شر سے بچیں اور شر کے عوض خیر کریں

جو کہتے ہیں یہ کہ ہے جسم دنیا وہ آئیں اور اس بہشت کی سیر کریں

تصیب سے اس قدر ان کو نفرت تھی کہ اسکو دشمن نوع انسان جانتے تھے اور سخت افسوس کے ساتھ فرماتے ہیں :-

تصیب کو ایک جز دین سمجھتے ہیں ہم جنم کو خلد بریں سمجھتے ہیں ہم

یہ ضرور ہے کہ ان کا رجحان مسلمانوں کی طرف ہے مگر وہ اس خیال سے نہیں ہے کہ کسی کے حق کی پامالی ہو اور اس سے مسلمان

قائدہ اٹھائیں۔ نہیں بلکہ وہ مسلمانوں کو اس لئے بیدار کرتے ہیں کہ وہ زندگی کی جدوجہد میں اپنا حصہ چھوڑ کر غافل نہ ہو جائیں
ہاں یہ ضرور متناہی تھی کہ وہ بھی دوسری قوموں کے ہمدوش ہو کر دنیا میں قائم اٹھائیں۔ مسلمانوں کی ایسی ترقی میں دوسری قوموں کی
بھی بہبودی کار از مغیر نظر آتا ہے۔ اگر وہ کمزور رہ جاتے تو ملک تو ملک کی ذمہ داریوں کا بار جو ان پر پڑنا چاہئے تھا وہ بھی ہمسایہ قوموں
کے سر پر پڑتا اور نتیجہ یہ ہوتا کہ وہ بھی بارگراں سمجھ کر اس زائد بوجھ کی متحمل نہ ہو سکیں۔

وطنیت

ان کو اپنے وطن سے اس قدر محبت تھی کہ جتنی ایک حقیقی فرزند کو اپنی ماں سے جگہ جگہ ان کے کلام سے اس جذبہ کی
حقیقت نمایاں ہے چنانچہ انھوں نے ایک مستقل بھی ”مثنوی حب وطن“ کے نام سے لکھی ہے جس کے مطالعہ سے آپ کو
اندازہ ہو گا کہ حرف حرف سے مولانا کی محبت ٹپکتی ہے اور جو کچھ بھی ہے سب خلوص اور وفاداری کے ساتھ تصنع اور ظاہر داری کی
کہیں جھلک نہیں۔ ان کی محبت اس قدر زیادہ ہے کہ فرماتے ہیں ۵

تیری اک مشت خاک کے بدلے لوں نہ ہرگز اگر بہشت ملے

اپنی محبت جتا کر دوسروں کو بھی اس سے محبت پیدا کر دیتے ہیں ان کو سخت تعجب ہوتا ہے کہ وہ لوگ کیسے ہیں جن کو وطن عزیز
نہیں ہوتا اس سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں کہ ۶ ۷ وطن تو تو ایسی چیز نہیں۔ وطن کی ترقی اور بہبودی کے لئے وہ کسی قوم کو غیر نہیں
سمجھتے اور ان کی تعلیم یہ ہے کہ ۵

تم اگر چاہتے ہو ملک کی حیر نہ کسی ہو وطن کو سمجھو غیر ہو مسلمان اس میں یا ہندو بودھ مذہب ہو یا کہ ہو برہمن
سب کو میٹھی نگاہ سے دیکھو سمجھو آنکھوں کی پتلیاں سب کو

ان کی وطن پرستی محض اس لئے نہیں ہے کہ انسان اپنے ملک کا روڑا بنارہے درود یوار سے محبت کر کے وطن ہی میں بیکار
پڑا رہے نہ ملک کی حالت پر غور کرے اور نہ کسی کے کام آئے چنانچہ فرماتے ہیں ۵
مرد ہو تو کسی کے کام آؤ در نہ کھاؤ بیو چلے جاؤ

وہ چاہتے ہیں کہ جذبہ وطنیت سے کام لیا جائے لنگڑے لوے مفلوک الحال جو وطن میں ہوں ان کی ہر ممکن طریقہ پر
مدد کی جائے ورنہ اگر حب وطن کے معنی صرف چپہ چپہ سے محبت ہی کے ہیں تو انسان کو شرف المخلوقات ہونے کا دعویٰ نہ کرنا چاہئے
اس لئے کہ یہ تو وہ نظری جذبہ ہے کہ انسان کیا حیوانات کو بھی اپنے وطن سے الفت ہوتی ہے بلکہ نباتات تک اس خوبی سے محروم نہیں
چنانچہ مثلاً فرماتے ہیں کہ جس طرح انسان اپنے وطن سے باہر جا کر پتھر مردہ رہتا ہے اسی طرح درخت بھی دوسرے ملک میں جا کر اپنی حالت
بدل دیتے ہیں۔ آم کا پودا اپنے ملک سے جا کر کابل میں بار آور نہیں ہو سکتا۔ انار بھی وغیرہ ہندوستان میں اتنا عمدہ پھل نہیں
لاتے جتنا اپنے وطن میں مختصر یہ کہ ۶ سوکھ جاتے ہیں روکھ فرقت میں۔

مولانا کی وطن پرستی کی سرحد قوم پرستی سے ملی ہوئی ہے بلکہ وہ اس خوبی سے جذبہ وطن پرستی کے ساتھ ہی ساتھ قوم پرستی سے تعارف کرا دیتے ہیں کہ سمجھنے والوں کو اس کا احساس مشکل سے ہوتا ہے کہ کہاں سے کہاں آگئے مولانا کے نزدیک وطن پرستی اس وقت تک مکمل ہے جب تک کہ انسان قوم پرست نہ ہو۔

قوم کو وطن سے کم نہیں سمجھتے بلکہ یوں کہنا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ وطن کو بہ نسبت قوم کے زیادہ عزیز رکھتے ہیں اور اس کی تعلیم یوں دیتے ہیں۔

قوم سے جان تک عزیز نہ ہو قوم سے بڑھ کے کوئی چیز نہ ہو

یہی خیالات تھے جنہوں نے مولانا کو اپنے قول پر کاربند کر دیا تھا۔ جن لوگوں کو واقفیت ہے وہ جانتے ہیں کہ انہوں نے اپنی زندگی قوم کی اصلاح کے لئے وقف کر دی تھی چنانچہ ان کے تمام کلام میں قومی جہلک ہے اور جہاں یہ جہلک ہے وہاں درد و اثر بھی بہ نسبت اور مقامات کے زیادہ نمایاں ہے۔ بیجا نہ ہوگا اگر یہ کہا جائے کہ مولانا شاعری محض وطن اور قوم کی اصلاح کیلئے کرتے تھے ورنہ ان کو شاعری سے کوئی سروکار نہ ہوتا۔

باقی.....

سید عجاز حسین بی لے

سونے کے نرخ میں حیرت انگیز کمی

سونادو روپے تولہ

زنگ دیکھ لو کس کر آزمالو

جرمنی کی حیرت انگیز ایجاد

اس سونے کی نہایت خوبصورت نازک اور منقش چوڑیاں جرمنی سے بن کر آئی ہیں۔ انہیں ایک خول کی صورت میں بنایا گیا ہے ان کے اندر ریشمی چوڑیاں ہیں جن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ بہترین زبرد اور یاقوت کے ٹکینے جڑ دے گئے ہیں۔ برسوں استعمال کرنے سے زنگ میں فرق نہیں آتا نہ سیاہی دیتی ہیں۔ صنف نازک کے لئے بہترین تحفہ۔ تین روپے میں پانسو روپے کا کام نکالا جاسکتا ہے۔ ہر سائز کی موجود ہیں سیکڑوں کی تعداد میں روزانہ فروخت ہوتی ہیں جلد منگوائے تاکہ اسٹاک ختم نہ ہو جائے۔ قیمت مع محصول ڈاک سے فی سٹ۔ دوست کا دام ساڑھے پانچ روپے۔ چار سٹ کے لئے دس روپے۔ ملنے کا پتہ ذیل میں درج ہے

زنانہ کاروبار دہلی

ہر قسم کا عطر صغریٰ علی محمد علی تاجر عطر لکھنؤ سے عطر منگائے۔

ان کے بخار کی ابتدا ایک ہزار روپیہ یومیہ فیس والے ڈاکٹر سے ہوتی ہے اور اٹھادس ہزار روپیہ فی گھنٹہ فیس والے ڈاکٹر پر یہ لوگ یونانی دوا خانہ دہلی کی دواؤں کو اتنا ہی غیر شاکستہ سمجھتے ہیں جتنا یورپ والے سوراج کے لئے آپ ہندوستانیوں کو غرض بخار کی ہر حرکت میں انگریزوں کی حرف بہ حرف نقل کرتے ہیں، لیکن جب ڈاکٹری تشخیص ”آپریشن“ پر مجبور کرتی ہے تو پھر آہستہ سے دہلی والے ”بڑے حکیم جی“ کا پلٹس استعمال کرنے پر راضی ہو جاتے ہیں، امیروں کے بخار آنے سے ان کی ”عورت ذات“ روتی چلاتی نہیں، البتہ فقیروں کے نام سے ان کے ملازمین خوب پلاؤ کھاتے ہیں، ”صدقے کے بکرے“ فوج ہوتے ہیں پیروں کے نذرانے دئے جاتے ہیں اور تحقیق بھوکے مرتے رہتے ہیں، امیروں کا بخار اکثر تاش کھیلنے اور گھوڑ دوڑ، وغیرہ سے بھی جاتا رہتا ہے۔

لیڈروں کا بخار

ہندوستانی لیڈروں کو کافی چندہ جمع کر لینے کے بعد بخار ضرور آتا ہے ان لوگوں میں بخار آنیکو کہتے ہیں کام کرتے کرتے صحت خراب ہو گئی ہے۔ اور جوں ہی کہ صحت خراب ہوئی ان کو ڈاکٹروں نے تقریر بند کر دینے کا مشورہ دیدیا اور منصوری یا شملہ تو دسیراے ہند کے ڈر سے جاتے نہیں البتہ اگر چندہ کافی ہے تو یورپ ضرور جاتے ہیں ”رٹہ کشمیر“ اور اگر شملہ ہی کا یہی زور رہا تو اکثر لیڈر کسوی بھی جایا کریں گے، لیڈروں کو بخار آتے ہی اردو اخبارات کے صفحات سیاہ ہوتے رہتے ہیں روزانہ انکی سابقہ خدمات کے تذکرے ہوتے ہیں ”رفنا صحت“ شائع ہوتی ہے۔ بیمار لیڈروں کو اخبارات ”صاحب فراش“ کہتے ہیں جسے ہندو اخبار پڑھنے والے ”فراش“ پڑھتے ہیں ان لوگوں کا جسم بھی تو لاجااتا ہے، اس موقع پر وہ بولیں کہ کیا لیڈروں کے وزن کیساتھ ان کی ایمانداری قوم جذبات بھی تولی جاتی ہیں؟ اس پر ہم نے جھنجلا کر کہا۔ دیکھو جی تم ہو ”صنف نازک“ تمہیں اس قسم کے سوالات کا کیا حق ہے؟ ان کی حالت اخبارات میں ہمیشہ ”رو بہ صحت“ رہتی ہے۔

یہ کبھی نہیں سنا کہ آج تو البتہ کبھی کبھی ”حالت نازک“ ہو جاتی ہے اور جو کبھی بیمار لیڈر صاحب ہوئے قوم کے مسلمان تو ہیں پھر حالت نازک ہوتے ہی تمام مساجد میں دعائے صحت کے لئے ہاتھ اٹھا اٹھا کر اور چلا چلا کر اللہ دے اور بندہ لے اس موقع پر وہ پھر بولیں کہ یہ مسلمان مرد جلسوں میں ہماری طرح بات بات پر رویا کیوں کرتے ہیں؟ ہم نے کہا کہ لیڈر خود رورور کر تقریر کرتے ہیں اور اسی کو کامیاب تقریر سمجھتے ہیں۔

افسروں کا بخار

یوں تو خدا ہر ہندوستانی کو غلام ہی رکھے کیونکہ اس کا افسر ہونا اس کے ہم قوم ماتحتوں کے لئے قیامت کم نہیں، بڑی مصیبت یہ ہے کہ پچاس روپے کی ملازمت کا افسر سمجھتا ہے لیکن خصوصیت سے خدا مسلمانوں کو مسلمانوں کا افسر تو کبھی نہ بنائے کیونکہ خیر سے ہندوستانی مسلمان کا دماغ افلاطون کے دماغ سے کسی طرح کم نہیں ہوتا ہے اگر کوئی ہندوستانی افسر صاحب بیمار ہو گئے یا حرارت ہی ہو گئی تو بس آپ کی بیمار داری کے لئے تمام عملہ ماتحت کو ہڑتال کرنا پڑتی ہے جس ماتحت کو دیکھے آپ کے دولت کدہ پر خیریت دریافت کرنے حاضر ہے، اور اگر کوئی خدا کو رازقی سمجھنے والا حضور کے دولت کدہ پر

حاضر نہ ہوا تو سمجھ لو کہ افسر صاحب کی نظر میں اس کے برابر گستاخ، نمک حرام کام چور اور نا اہل کوئی دوسرا نہیں ہمارے ایک دوست نے تجربہ کیا کہ افسر صاحب کی سیاری میں مستعدی سے ان کے پاؤں داب دے دوسرے ہی صینہ اون کا اضافہ کر دیا گیا، غرض انکی بیماری میں تھم خانگی خدمات دفتر کے سرکاری اہل کار اور چیراسی انجام دیتے ہیں یہ ایک ہی دن کے بخار میں اس قدر کمزور ہو جاتے ہیں کہ ماتحتوں سے سیدھی طرح بات نہیں کرتے بھی تو خدا ان ہندوستانی گنجوں کو سوراخ کے ناخن نہیں دیتا۔

بچوں کا بخار | اللہ عز و جل ہمارے ننھے میاں کی عمر کے بچے بخار سے اتنے ہی بے پردا ہوتے ہیں جتنا یورپ والے مشرقی ممالک کو آزادی دینے سے لہذا جب بچوں کو بخار آتا ہے تو صرف ان کا منہ لال ہو جاتا ہے مگر وہ کھیتے ہی پھرتے ہیں لیتہ انکی والدہ کا بڑا حال ہوتا ہے چنانچہ ادھر بچہ کو بخار آیا اور ادھر اس کی ماں نے اس کے باپ پر مصیبتوں کا پھاڑ توڑ دیا، حکم ہوا کہ جاؤ حکیم کو لاؤ، ڈاکٹر کو لاؤ، بڑے مولوی صاحب کو لاؤ، پیر صاحب کو لاؤ، تعویذ لاؤ، بکرا ذبح کر دو، نیا زردو، قاتحہ پڑھو، ادھر اللہ میاں سے کہنا شروع کیا، اگر میرا بچہ اچھا ہو گیا تو نفل پڑھو گی، روزے رکھوں گی، مساکین کو کھانا کھلاؤنگی، وغیرہ، اب اگر ان تمام باتوں میں سے کسی ایک کے متعلق شوہر صاحب نے اپنی مجبوری کا اظہار کیا تو پھر قیامت ہے۔ رات بھر بچہ کو گود میں لئے بیٹھتی ہیں، کبھی روتی ہیں تو کبھی دعا کرتی ہیں۔ اب اگر کہیں دن بھر کی ملازمانی تھکن سے شوہر صاحب سو گئے تو ادھم مچادی۔ گوجی کی ٹھنڈی ہواؤں سے خود چراغ جاپو کر رہ جاتی ہیں مگر رات بھر تمام گھر مصیبت میں مبتلا رہتا ہے، گویا ایک بچہ کو بخار نہیں آتا تمام خاندان بخار میں مبتلا کر دیا جاتا ہے۔

طلبہ کا بخار | طلبہ کا بخار نہایت پر لطف ہوتا ہے، زمانہ طالب علمی میں دس برس سے بیس برس کی عمر تک روزانہ بخار آنے کی متناہر طالب علم کے دل میں خود بخود پیدا ہوتی ہے خصوصاً مدرسہ کے اوقات میں نہایت پابندی سے بخار آتا ہے اور اگر بے رحم والدین نے اس حالت میں بھی مدرسہ بھیج دیا تو پھر طالب علم درجہ میں بیٹھتے ہی نہایت اہتمام سے کراہتا ہے، بات کے رد مال سے سر کو باندھ لیتا ہے، بخار کے ساتھ ہی سر میں درد، پیٹ میں درد، اور ہات پاؤں میں درد ضرور ہوتا ہے کیونکہ درد کسی ماسٹر کو نظر نہیں آتا ہے لہذا جہاں جا ہا درد مبتلا دیا، خاص کر ریاضی اور دینیات، کے گھنٹوں میں درد حد سے گزر جاتا ہے مگر ہاکی اور فٹ بال کے وقت طاعون کے طلبہ بھی تندرست ہو جاتے ہیں۔ البتہ تعلیم کا گھنٹہ شروع ہوتے ہی طالب علم منہ لیور لیتا ہے اسے ابکائی پر ابکائی آتی ہے آنکھیں مل مل کر سُرخ کر لی جاتی ہیں، جھانٹی پر جھانٹی لی جاتی ہے، یہاں تک کہ ماسٹر تنگ آکر چھٹی دیدیتا ہے اور طالب علم صاحب اسکول کی عمارت کے سامنے تک نہایت ضعیف رفتار سے چلتے ہیں گویا آپ کو چکر آ رہا ہے، لیکن جوں ہی کہ اسکول کی عمارت سے آگے پڑے کہ قہقہہ لگایا اور بخار جاتا رہا گویا ماسٹر کو بے وقوف بنالیا، ایسے بخار میں لاڈ پیار کرنے والے ماں باپ سے یہ بخاری طالب علم سائیکل، جوتا، موزے، اور فیشن کی ہر چیز آسانی سے وصول کر لیتے ہیں،

ہمارا بخار | اسلامی عقیدہ ہے کہ خدا اپنے محبوب بندوں کو بیمار کر کے ان کے گناہ اور بلائیں کم کر دیتا ہے دوسرے یہ کہ بیماری اصل میں

انسان کے جسم کی تزکوۃ ہے لہذا اس حساب سے ہر مسلمان کو سوائے ہمارے کم از کم ہفتہ میں ایک مرتبہ ضرور بیمار ہونا چاہئے آپ کا ہی سمجھیں تو ہم کہہ دیتے ہیں کہ دنیا میں اگر ہم کسی کام کو بدترین کام سمجھتے ہیں تو وہ غسل کرنا ہے اور اسی لئے ہم سوائے عیدین کے کبھی نہیں نہاتے کیونکہ اس میں علاوہ پانی کے سراف کے وقت بھی تو صنائع ہوتا ہے۔ مگر بڑا ہوا اس موسم گرما کا کہ اس نے ۲۱ جون ۱۹۲۷ء کی دوپہر کو بے دم کر دیا، ادھر قوم کی ظالمانہ ناقدر دانی اور منافق دوستوں کی دراندازیوں سے خس خانہ بھی باقی نہیں ہے لہذا چاروناچار غسل جو کیا تو لو لگ گئی صبح جو بستر سے اٹھنا چاہا تو اکڑے ہوئے تھے، تنگ آکر بیٹھے ہی لیٹے کلمہ شریف پڑھا مگر تھوڑی ہی دیر بعد حرارت شروع ہو گئی، حرارت میں یہ ہوتا ہے کہ اچھا خاصا انسان خواہ مخواہ اکڑنے لگتا ہے جمائیاں بکثرت آتی ہیں چنانچہ ہمارے ہات پاؤں بھی جب اونچے نیچے ہونے لگے تو ہم نے اُن سے کہا کہ

”دالاں میں چار پائی بچھا دو اور کھاف اوڑھا دو کیونکہ ہمیں بخار آنے

والا ہے۔“

۵۰ بدیں تمحیص تو ہم ہو گیا ہے جاؤ باہر چبوترے پر جا بیٹھو زرا دل بہلاؤ، تو مگر دل زرا نہ بہلا اور ہات پاؤں مشکلتے ہوئے پھر گھر میں آگئے اور کہا کہ چادر اڑھا دو، پھر کھاف اڑھا دو، پھر کہا دوسرا کھاف، پھر تیسرا، پھر چوتھا، پھر پانچواں، پھر چھٹا، پھر تو پاؤں پھر آٹھواں، پھر نوواں، یہ گویا تمام ۶ یزوں کے کھاف تھے جو ہمارے اوپر ڈال دئے گئے مگر سردی کم نہ ہوئی تو ۵۰ بھی ہمارے اوپر پڑیں مگر پکیپی کا یہ حال کہ جاتی ہی نہ تھی یہاں تک کہ اب ہمیں خبر نہیں کہ ہم کہاں گئے آنکھ کھلی تو کہا سیلاچی لاؤ اور اب غوغو کرنا شروع کر دیا جسے عن عام میں استغفر غ کہتے ہیں، اس کے بعد کہا ”ارے رے“، ”افرے“، ”اشدرے“ یا ”اشدرا خدا“، توبہ، توبہ ہے توبہ، ہائے رے، کہ پھر..... اب جو آنکھ کھلی تو دیکھا کہ ۵۰ رو رہی تھیں۔ مگر ہم نے انھیں روتا دیکھ کر پھر آنکھیں..... اب جو آنکھ کھلی تو ایسا معلوم ہوا کہ لاہور کے ہندو مسلم فساد میں کسی سکھ نے ہمارے سر میں کرپان مار دی ہے اور سر ہے کہ مارے درد کے اٹھایا نہیں جاتا، کبھی ایسا بغیر جرت بوجھ اٹھاتے اٹھاتے جسم چور ہو گیا ہے کہ پھر..... اب جو آنکھ کھلی تو ایسا معلوم ہوا کہ دہلی میں قیام کے لئے بوس خوا مخواہ گولی چلا رہی تھی اور ہماری دونوں ٹانگوں میں گولی لگ گئی ہے لہذا مارے درد کے لگے چار پائی پر پاؤں مارنے کہ پھر..... اب جو آنکھ کھلی تو دیکھا کہ ۵۰ بیٹھی پاؤں داب رہی ہیں۔ اسوقت معلوم ہوا کہ غیب گھرانے کی لڑکی سے شادی کرنے سے یہ فائدہ بھی ہوتا ہے ورنہ اسوقت اگر ہوتی کوئی گرس اسکول کی تو جھوٹے پر اکڑی بیٹھی رہتی اور خادمہ کو حکم دیتی کہ پاؤں دابو کہ یکایک ننھے میاں نے چیخ ماری اور انھوں نے ہمارے پاؤں چھوڑ کر ننھے میاں کو گود میں لے لیا کیونکہ ننھے میاں کو آشوب چشم کا عارضہ تھا، اور گو ہم نے پھر بھی ٹانگیں ماریں خوب شور مچایا مگر انھوں نے ننھے میاں کے مقابل ہماری طرف دیکھا بھی نہیں کہ پھر..... اب جو آنکھ کھلی تو دین و دنیا کی راحت حضرت والدہ محترمہ سر بانے بیٹھی ہیں مگر بے حد ملول و آبدیدہ گہرا کراٹھ بیٹھے اور عرض کیا کہ آپ آرام فرمائیے صرف دعا کا محتاج ہوں کہ پھر.....

عدہ عطر خرید کرتے وقت صہفر علی محمد علی تاجر عطر کو فراموش نہ کیجئے

اب جو آنکھ کھلی تو محترمہ مدودہ نے فرمایا کہ بیٹا گھر آؤ نہیں تمہیں بخار ہے کہ ہم پھر..... اب جو آنکھ کھلی تو دیکھا کہ عزیزہ ہمشیرہ اور قبلہ دو جہاں والد صاحب بھی تشریف لے آئے ہیں کہ ہم پھر..... اب جو آنکھ کھلی تو دیکھا کہ یہ تمام سرپرست اور رفیق دھرمیان دعائیں کر رہے ہیں کہ ہم پھر..... مگر فوراً ہی سنبھل کر کہا کہ ہمیں تکیہ کے سہارے سے بٹھا دو اسوقت بخار کی شدت لمحہ بہ لمحہ بڑھ رہی تھی اور ہمارے حواس..... بس میٹھے ہی ہم نے وہ دہواں دھار تقریر شروع کر دی جو شدید بخار کی حالت میں ہر لیڈر، مدبر، فلاسفر، اور اڈیٹر کرتا ہے عنوان تقریر تو صرف اتنا تھا کہ:-

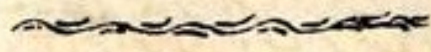
”ہم اچھے ہو جائیں گے آپ حضرات گہرائیں نہیں مگر الفاظ کی شوکت، ترتیب، ترصیح اور بندش کی تعریف کچھ سننے والوں ہی کو معلوم ہے اور گو تقریر ہم نے کی تھی مگر خود ایک لفظ یاد نہیں رہا البتہ ہماری وہ تقریر جسکو آنکھوں نے کسی قدر قلمند کیا تھا یہ ہے مثلاً ہم نے یکایک کہا:-

پانی لاؤ، لاؤ، لاؤ، لاؤ، لاؤ، جب پانی دیا تو کہا کہ اس میں پیاز کا بگھار کیوں

نہیں دیا؟

ان جملوں کو عنوان کی تقریر سے ملاتے جلیے دیکھئے کس قدر ربط و مناسبت ہے؟ پھر کہا، جی ہاں، جی ہاں بہت اچھا حاضر ہوا حالانکہ ہوتے ہیں کسی نے آواز نہیں دی تھی، پھر کہا ٹوپی لاؤ ٹوپی حج کا وقت جا رہا ہے، بچے عمر گزر گئی لندن اور پیرس جانے کے سوا کہ مظہر کا کبھی خیال بھی نہیں آیا اور نہ آج کل کے مسلمان امیروں کو آتا ہو مگر پھر کہا ارے بھائی تانگہ لاؤ ورنہ حج ہو جائیگا، پھر کہا نہیں نہیں مضمون غلط چھپا ہے غلط پھر کہا سورہ پیمہ فی صفحہ لیں گے سورہ پیمہ حالانکہ اردو کا ایک رسالہ بھی نہیں جو ایک پیمہ فی صفحہ معاوضہ دیتا ہو سب کے سب ”براہ کرم“ ہی طلب فرماتے ہیں پھر اس انگریز کو سامنے سے علیحدہ کر دو حالانکہ خدا معاف فرمائے یہ ہمارے بڑے سارے صاحب تھے اور اسی لئے وہ بدصحت بہت خفا تھیں اور کہتی تھیں کہ تم بجا میں بہت بکتے ہو اور اب دیکھنا اس مضمون کو پڑھ کر وہ اور بھی آگ بگولہ ہو جائیں گی کہ ہم نے ظاہر بھی کر دیا پھر کہا وہ منی آڈر والا آگیا خدا سمجھے افلاس میں ایسی ہی سوچتی ہے غرض اس تقریر کا وہ زور رہا کہ الامان، مگر آخر میں کہا لا الہ، اشد اندش، استغفر اللہ، مگر یہ الفاظ قبلہ والد مدظلہ کی ڈانٹ کا نتیجہ تھے ہماری اسلام دوستی کا نہیں کہ ہم پھر..... اب بخار نے اپنی آخری شدت اختیار کر لی کہ یکایک ہیں قارورہ کی حاجت ہوئی اور ہم لحاف پھینک کر اٹھے اب جو قارورہ کے لئے چوکی پر جا کر بیٹھے تو اٹھنے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ کیونکہ شدید بخار کی حالت میں قارورہ کرنے میں جو لطف آتا ہے اسے بخار دالے ہی کچھ خوب جانتے ہیں خیر وہ اٹھا کر لائیں اور ہم چار پائی پر آتے ہی پھر..... اب جو آنکھ کھلی تو کیا دیکھتے ہیں کہ قبلہ محترم حکیم حازق مولوی ضیاء الحسن صاحب ہمارا ہاتھ پکڑے بیٹھے ہیں، ہم نے ادب سے سلام کیا۔ قبلہ موصوف نے ہمارے علمی دماغ اور علمی مزاج کی نزاکت کو ملحوظ رکھتے ہوئے نہایت مختصر نسخہ تحریر فرمایا لیکن جب عطار کے ہاں سے یہ نسخہ لایا گیا تو بے مبالغہ ایک سپاہی کا فوجی راشن تھا، تیار ہوا تو کوئی نصف سیر

باقی تھا جسے اللہ شافی اللہ کافی کھکرا انھوں نے ہمیں بلایا تو کیا بیٹ میں بھر دیا حکیم صاحب قبلہ نے ازراہ رحمت حکیمانہ چلتے وقت ہمارے لئے دنیا کی تمام غذائیں حرام کر دیں صرف دلیا اور کچھڑی حلال فرما گئے یہ بھی فرمایا کہ زنا محاف میں دب کر پسینہ لیلو جس کی تعمیل تو راگرا لگی اور کوئی چار محاف شروع ماہ جون کے جہنمی موسم میں ہمارے اوپر ڈال دئے گئے اب جو دم گھٹنے لگا تو ہم نے کوشش کی کہ قدرے چہرہ باہر نکال لیں کہ چمک کر بول ہی تو اٹھیں کہ ”دیکھو دیکھو پسینہ میں محاف الگ نہ کرو خدا نخواستہ اگر ہوا لگ گئی تو پھر کیا ہوگا“ خیر صاحب بقول کسی شاعر کے غصہ فقیر کا اوپر جان فقیر کی کے۔ چپ سا دھبے پڑے رہے اور جب پسینہ میں نہ لگے تو انھوں نے پسینہ خشک کیا اور اب طبیعت بحال ہوئی۔



اب بھوک کا یہ زور کہ تمام دنیا کے کھانے اڑانے کو تیار مگر وہاں حکیم صاحب کے دئے کے سوا کوئی چیز جائز نہیں دلیا کھایا یہی تھا کہ پھر جاڑا شروع ہوا اور ہم پھر..... کہ انھوں نے ہمیں ہوشیار کر کے کہا دیکھو کوئی آواز دے رہا ہے اب یہ محلہ واسے عیادت کو آنا شروع ہوئے پردہ کرایا اور کھانا بجائے یہ محلے کے ایک بزرگ تھے آتے ہی ہم ایسے بخار زدہ مریض سے مخاطب ہو کر فرمایا۔ کیوں میاں کیسی طبیعت ہے؟ کل تو تم اچھے تھے، کیا لو لگ گئی ہے خیر جاتی رہیگی، کہ دوسری آواز آئی اُنھیں بھی اندر بلا یا گیا تو آتے ہی بعد سلام سنوں آنکھ انھوں نے ہماری نبض ملاحظہ فرمائی کہ تیسری آواز آئی یہ بھی گھر میں آدھر تو عیادت والوں کی آمد آدھر گھر کی تمام عورتیں کمرہ میں بند اور ارے گرمی کے آفت میں مگر عیادت والوں کا سلسلہ ترقی پزیر تھا ہمارا ضعف کے مارے برا حال مگر اب عیادت کے ہم سے جو سوالات ہو رہے تھے وہ اس طرح کہ:-

کوئی نبض دیکھتا ہے؟ کوئی پیشانی پر ہاتھ رکھ کر بخار کا اندازہ کرتا ہے؟ ایک صاحب نے فرمایا کیوں مولانا کیا حال ہے پھر فرمایا اماں تم بھی اتنی سی بخیر مایں لیٹ گئے ہم تو تمھاری عمر میں ایسے بخار کو خاطر میں ہی نہیں لاتے، اچھا یہ تو بتلاؤ، بخار کب سے آیا ہے، جاڑے سے آتا ہے؟ متلی تو نہیں ہوتی سر میں درد ہے؟ کھانسی تو نہیں ہے؟ پسینہ آتا ہے یا نہیں؟ کس وقت اتر جاتا ہے؟ منہ کا ذائقہ کیسا ہے؟ بھوک بھی معلوم ہوتی ہے یا نہیں؟ مگر یہاں ضعف سے یہ حال کہ....

..... مگر انھوں نے ہمارا ہاتھ پکڑ کر زور سے ہلایا اور فرمایا مولانا، مولانا، مولانا، اماں مولانا، بولو تو، ہوشیار تو ہو، دیکھو یہ کون کون بیٹھا ہے؟ اچھا تو بتاؤ یہ کرسی پر کون بیٹھا ہے؟ کیا دل گھیرتا ہے؟ غرض سوالات کی کثرت سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہم بنگال کی کسی بغادت کے مقدمہ میں بحیثیت سلطانی گواہ عدالت کے کٹہرے میں کھڑے ہیں اور دس بارہ دلیل ہم سے جرح کر رہے ہیں، خیر یہاں تک بھی معاملہ غنیمت تھا مگر اب عیادت والوں نے ایک اور ستم ڈھایا، ایک صاحب بولے

”ہاں بھائی علاج کس کا شروع کیا ہے؟ ہم نے حکیم صاحب کا نام بتلایا تو ادھ کھکرا حکیم صاحب پر اعتراضات شروع کر دئے اور ایک دوسرے حکیم صاحب کے علاج کی تعریف شروع کر دی ایک صاحب بولے کہ میاں تم تو علاج دلاج چھوڑو بس آم کا شربت پی لو تمام شکایتیں جاتی رہیں گی ایک صاحب نے تو ہماری حجامت ہی بنا ڈالی فرمائی

مولانا گرمی بہت ہے آپ یہ سر کے بال اسی وقت منڈا دیجئے۔

غرض عیادت کیا جتنی خاصا جلیان والہ باغ کا انگریزی مارشل لا تھا جس میں سب کچھ گزر گئی اسی طرح کوئی ایک ہفتہ بخار میں مبتلا رہے نصف تنخواہ رخصت میں وضع ہو گئی، دس روپیہ عطار کے قرض ہو گئے عیادت والوں کی خاطر میں کوئی پانچ روپیہ کی پانچ چھالیہ خرچ ہوئی تین روپیہ حکیم صاحب کے تانگہ کے دئے میں روپیہ فیس میں گئے والدین اور انھوں نے رو رو کر آنسوؤں کے دریا بھار کے معاوضہ کے مضامین نہ لکھ سکے، بارہ فصل خدا اب صحت یاب ہو گئے مگر ہماری قوم کو اتنا ہی غم ہوا کہ

”عصہ سے ملا صاحب کا کوئی مضمون نہیں دیکھا اور بس“

اگر یورپ کا کوئی مضمون نگار بیمار ہوتا تو قوم اس کے تمام مصارف خود ادا کرتی، یوں بیمار ہوا کرتے ہیں ہندوستان کے غربا، دعا ہے کہ خدا ہمیں ہمیشہ تندرست رکھے اور یہ جس قدر انگریز یورپ والے ہیں تہذیب سکھانے کے لئے ہندوستان میں پڑے ہیں خدا کرے انھیں ایک ایک سال ایسا ہی بخار آئے

رموزی

کیا یہ کتابیں آپ کے کتب خانہ میں ہیں

انقلاب فرانس - نہایت دلچسپ فرانسیسی ناول - ۱
سیلاب خوں - واقعات غدر کا قابل دید فسانہ - ۲
بزم خیال - شعور فارسی وارو مشہور لطائف - ۳
اسرار بالشویزم - نہایت دلچسپ فسانہ کی صورت میں - ۴
شاہ میر نسوان - عبدالسلام مشہور خواتین کے حالات - ۵
احرار اسلام - مولانا ابوالکلام کا مشہور رسالہ - ۶
اسرار نباتات - قواعد نباتات کے سربستہ راز کا انکشاف - ۷
دیوان غالب - شرح و مقدمہ از جذباتی صاحب - ۸
علم الاخلاق - مولوی سید کرامت حسین صاحب کی پیش تصنیف - ۹
نازمین مراکش - دلچسپ تاریخی ناول قیمت صرف ۸ - ۱۰
اشاعت اسلام - اسلام پرچم الملک کلیمیش رسالہ - ۱۱
انقلاب نسوان - عورتوں کے نہایت مفید کتاب - ۱۲
سیاحت زمین - ۸۸ دن میں بمبیل فسانہ قیمت ۴ - ۱۳
اجتماع ضدیں - صلاح معاشرت فسانہ کی صورت میں - ۱۴
نابینا علماء - مولانا شہرانی کی مشہور کتاب - ۱۵
ایکملات - ۶۰ - ۱۶

جاسوسی کے بہترین ناول

بیرام چور - نیلی چھتری - بیرام کی گرفتاری - ۹
بیرام کی رہائی - ۱۰
بیرام کی آزادی - ۱۱
بیرام کی سرگزشت - ۱۲
بیرام کی حیرت - ۱۳
بیرام کی جاسوسی - ۱۴

منیجر نگار بک ایجنسی نظیر آباد لکھنؤ

عقبات صغیر علامہ محمد تاج عطر لکھنؤ سے منگائیے

گنگا

ہمکا دیا ہے ساحل بھولوں کی طرح تو نے
چمکا دیا ہے صحرا تیرے ہی رنگ بونے
تو رشک گلستاں ہے
اے گلزار گنگا

موجِ رداں میں تیرے ذرات برقِ خشاں
ہمپایہ فلک ہے تیرا حجابِ رقصاں
قطرے گہر ہیں تیرے
اے آبدار گنگا

ہیں زندہ تیرے دم سے ارمان گوپیوں کے
ہوتے ہیں تیرے اندر اشناں گوپیوں کے

ہے تیرا حسن ان میں

اے جلوہ بار گنگا

ساد ہونے تیرے در پر دھونی رمانی آ کر
اور دان کی کسی نے گنگا بساتی آ کر

ہیں تیرے فیض جاری

اے زر نگار گنگا

چرنوں میں تیرے آکر چھپتے ہیں ماہ پارے
کرتی ہیں تیری موجیں ابرو سے کچھ اشارے
تو جان دکشتی ہے
اے شاندار گنگا

دھرت پرست ہوں میں مسلکِ مرا جدا ہے

سات آسماں کے ادھر رہتا مرا خدا ہے

کرتا ہوں ندیوں میں

تجھ کو شمار گنگا

اسلاف کے قدم کو چوما ہے چونکہ تو نے

گردیدہ کر لیا ہے مجھ کو بھی تیری خونے

مجھ پر عنایتوں کا

ہے تیری بار گنگا

محمود اسرار نیلی

من پر تو جانا نام

آئینہ حیرانم؟ یا صحنِ گلستاںم

من سوختہ سامانم؟ یا مہرِ خشاںم

دائم بخدا۔ دائم نے انیم دے آئم

من پر تو جانا نام

مجبور بہ تقدیرم؟ یا صاحبِ تدبیرم؟

من پیکرِ تصویرم؟ یا خوگرِ تقریرم؟

دائم بخدا۔ دائم نے انیم دے آئم

من پر تو جانا نام

آوازِ دلِ خوشیم؟ یا سازِ دلِ خوشیم؟

من نازِ دلِ خوشیم؟ یا رازِ دلِ خوشیم؟

دائم بخدا دائم نے انیم دے آئم

من پر تو جانا نام

آئینِ حزمیں

غزلیات

محمد عبدالباسط۔ باسط بھوپالی کو

نہو فغاں کار گر نہیں ہے، نہود عا میں اثر نہیں ہے
یہ جلوہ تابی جہان الفت کی دیدنی ہے، مگر نہیں ہے
نظر کو ذوق تلاش کیسے قدم کو تشویش جستجو کیوں ہو
نہ آرزوؤں میں جوش پہاں نہ دلو لوں میں خروش رسوا
میں جسکو تحفہ میں پیش کر دوں وہ جسکو زیب نظر بنالیں
ادھر جمال کرشمہ پرور ادھر ستمہائے حشر منظر
مری محبت کی داستانیں فلک پہ ہستے ہیں سننے والے

خدا نے وہ رات مجھکو دی ہے جسے تلاش سحر نہیں ہے
کہ ذرہ ذرہ ترپ رہا ہے تجلیوں کو خبر نہیں ہے
دل ایسے جلووں کو ڈھونڈتا ہے جسو محال نظر نہیں ہے
یہ حیرت جلوہ کیا ہے یارب کہ سکو اپنی خبر نہیں ہے
الہی دامن آرزو میں کوئی بھی ایسا گر نہیں ہے
سنہالے دل کو کوئی تو کیونکر کسیکو تاب مقرر نہیں ہے
مگر وہ انجان اور ایسے کہ اکی کو کچھ بھی خبر نہیں ہے

کسی کی کافر نگاہیاں بھی تو اڑتی ہیں دلوں کو باسط

مگر تہیں ہے تو ایک میری تباہیوں پر نظر نہیں ہے

شمع

ضبط پر قدرت ہر تجھکو یہ کہ تو خاموش ہے
تیرے شکوک سے ظاہر سچ بتیابی کا حال
تیری دھیمی روشنی میں نہاں الفت کا راز
تیرا جلد اور سناہل بصیرت کے لئے

گر چہ تیرے سینے میں یاں الم کا جوش ہے
بزم میں جلتا ہی تیری زندگی کا ہے مال
تیری ہر ہر سانس ہے فسانہ سوز و گداز
شمع تو شمع ہدایت ہے محبت کے لئے

ضبط کرتی ہے جسے تو کوں سا وہ راز ہے
کس ظلم راز کی اسے شمع تو دساز ہے

کس کس غم میں نسوے اپنا منہ مہوتی ہو
کیا تجھے بھی ہے کسی کی کم نگاہی کا گلا
ضبط کرتی ہے جسے تو کوں سا وہ راز ہے
کس ظلم راز کی اسے شمع تو دساز ہے

ہے کوئی بات آج ہوئے کو
آنکھلا نہ تم کہیں سے ادھر
کون ہو گا شریک شادی و غم
کٹ گئی ساری رات آنکھوں میں
ہو چکی باز میں بھی آخر
وہ بشر بھی عجب بشر ہے جگر

جی بہت چاہتا ہے رونے کو
کوئی بیٹھا ہے جاں کھونے کو
کوئی منہ کو ہے نہ رونے کو
ہم سے کیا پوچھے ہو سونے کو
ہو گیا جو رہا تھا مونس کو
فرض سمجھے جو جان کھونے کو

جگر بریلوی

ہر قسم کا عطر صہر علی محمد علی تاج عطر لکھنؤ سے بہترین عطر منگائیے

دل شاہماں پوری

نظیر لودھیانوی

جویاے حقیقت ہوں عالم سجدگانہ دل ہے طرف کعبہ رخ جانب بچکانہ
تائیریاں بھر دے گردش پیانہ ساقی کو سنانا ہے فسانہ در فسانہ
ہر ذرہ میں پردہ اک شعلہ بھرتا ہے اس اہل نظر دیکھو خاک ستر پر دانہ
اک کیف نے دونوں پرستانہ اثر ڈالا میکش ہے زخوردقہ چکر میں ہے پیانہ
جب صاعقہ لہرائے حد جانا نزلگی چل وادی امین تک سن طور کا فسانہ
ہے مشرب زنداں میں انداز طلب بھی ہر گردش ساغر پر ایک نعرہ مستانہ
گی گریہ پیہم نے تشریح غم پنہان ہر شک مسلسل سے فسانہ در فسانہ
پردہ سے عیاں ہو کر پردہ میں ناں جو چھا جاگی خود حیرت اسے جلوہ جنانہ
یوں جل کے سر مخفل تصویر وفا کہنچی بھرتی ہے نگاہوں میں چاند باری پر دانہ
اللہ کے کیف سے ادب ہی عالم میں معراج تھی بخود کی اک لغزش مستانہ
حالات الم لکڑ بھارنے دم توڑا آخر کا یہی ٹکڑا تھا حاصل فسانہ
وہ حیرت نظارہ وہ منظر محویت وہ برق کے پردہ میں انداز جابانہ
کیا جانے کہاں موجیں کھینچ لے جاتی ہیں پہنچا ہیں ساحل تک و ہمت مردانہ
دنیاے حقیقت میں آزاد تین ہیں ہم نے کبھی ٹکڑا یا کعبہ سے نہ بچانہ
اک مست بھی آدل کتیا ہو گزرا ہے صد زہد بیک جہر عہ نریری و بچانہ

فرخ بناری

مجنوں گورکھپوری

ثبات رنگ بوئے گل بہار بولتا تھا یہ دودل کا تماشا ہے جو آغاز خزاں تک
کبھی چلتی ہے آندھی ادھ کبھی بجلی چمکتی ہے یہ ہنگامہ چین میں صرف میرا شیاں تک
مغرب رات دن لیکن نہیں معلوم اب تک کہاں آ رہے ہیں درہم جان کا ٹکڑا
شریک رنگ مخمل سرخی خون تمنہ ہے تمھاری بزم کی رونق ہمارا شیاں تک
کیس ایک فریب تجوید بھر ٹھرنے دو خبر کیا ہے کہ حد عرصہ کان کہاں تک
ازل سے خاتمہ پر آج تک کی سافر خ نہیں معلوم طول داستان غم کہاں تک
بشیاں ہو گئے ناصق سنکے مجھ کو دیاں میری یہ دو دودل کا تماشا ہے جو آغاز خزاں تک
وہی رسوائیاں میری وہی بزمیاں میری یہ ہنگامہ چین میں صرف میرا شیاں تک
مرے صیاد سرگرداں آتا کوئی کہتا تھا کہاں رک گئے بجلی پر شاخ آشیان میری
بھڑک ٹھٹھکیں رنگ پھولوں کا کھڑے سکھا دھندلیوں کو کوئی طرز قتلان میری
جنون کی شور شول کے لیے ایام اسیری تک
مری زنجیر کے نالوں میں سن لودھیاں میری

استفسارات

غالب کا مذہب

(جناب سید اوسط علی صاحب - برہان پور)

اس وقت مختلف رسائل میں غالب کے مذہب کے متعلق بھی بحث چھڑی ہوئی ہے کوئی کتاب ہے کہ وہ شیعہ تھے، کوئی انہیں سنی ثابت کرتا ہے، آپ کو اس مسئلہ میں کیا ہے مولانا حالی نے یادگار غالب میں جو رباعی غالب کی درج کی ہے اور جس کا آخری مصرعہ ہے :-

شیعی کیونکر جو مادر اہل البہری

اس سے تصانف ثابت ہوتا ہے کہ وہ شیعہ نہ تھا۔

(نگار) مجھے یاد پڑتا ہے کہ شاید اب دو سال قبل لکھنؤ کے کسی صاحب طبقہ اسد اللہی کے متعلق استفسار کیا تھا اور اسی سلسلہ میں غالب کی نسبت بھی ایک مختصر گفتگو کی گئی تھی کہ اس کا اپنے آپ کو اسد اللہی کہنا کیا معنی رکھتا ہے اور جہاں تک مجھے خیال ہے میں نے اس میں یہ لکھا تھا کہ غالب یقیناً تقفین شیعہ تھا۔ چنانچہ اس استفسار کا تعلق براہ راست غالب کے مذہب نہ تھا اس لئے اس سے زیادہ لکھنے کی ضرورت بھی نہ تھی لیکن اب جبکہ آپ نے اسکو اصل سوال ہی قرار دیا ہے تو مجھے صاف صاف کہہ دینا چاہئے کہ غالب کو سنی کہنا بالکل ایسا ہی ہے جیسے کوئی ذوق کو شیعہ کہے اس سے زیادہ تحریف حرکت اور کوئی نہیں ہو سکتی کہ سنی جماعت محض اس لئے کہ غالب ایک اچھا شاعر تھا اسے اپنے گروہ میں شامل کرنے کے لئے عید از قیاس تا دیوانہ کلام در انحالیکہ وہ شخص جس کے مذہب کے متعلق فیصلہ ہو رہا ہے وہ چیخ چیخ کر کہہ رہا ہے کہ میں شیعہ ہوں اور شیعہ بھی ایسا جو باوجود (عقاید کے لحاظ سے) علی اللہی نہ ہونے کے اپنے آپ کو علی اللہی کہہ رہا ہے۔ اس کے قطعات نوحہ و تاجتہ وغیرہ دیکھئے اور خود غور کیجئے کہ جو معبود خلائق بوتراب کہے جو کار خدا بہ عرصہ محشر کند علی کا قائل ہو جو یہ دعویٰ کرے کہ :-

اُس کو آپ شیعہ نہ کہیں گے تو کیا کہیں گے۔ ایک ترکیب بند میں اُس نے اپنے غلو کو دھجکے ان الفاظ میں ظاہر کیا ہے :-

عاشقم لیکن ندائی کر خرد بیگناہم ہوشیارم با خدا و با علی دیوانہ ام از قناتی الشیخ مشہود قناتی اللہ باد محو گشتم در علی دگر سخن کوتاہ باد شہسوی ابرگر بار میں حضرت علی کو وہ عین ذات نبوی سمجھ کر کہتا ہے :-

نہ گنجہ دوئی در نبی و امام کو علیہ الصلوٰۃ و علیہ السلام شاہ نجف دصی نبی، مرتضیٰ علی آقا ازائتہ اول و ثانی زنجیتن

حالی نے جہاں غالب کی وہ رباعی درج کی ہے جس کا حوالہ آپ نے دیا ہے وہیں یہ صراحت بھی کر دی ہے کہ یہ صرف تفریح طبع تھا، ورنہ حقیقت یہی ہے کہ ایک تنفس بھی ایسا نہ تھا جو مرزا کو شیعہ یا کم سے تفضیلی نہ جانتا ہو۔

اس سے بھی زیادہ صراحت اس کے تشیع کے اگر آچھتے ہیں تو ذیل کے شعروں کو ملاحظہ کیجئے :-
ایک قصیدہ میں وہ حضرت علی کو اس شان سے پیش کرتا ہے :-

نفس نبی، خداے نصیری، امام خلق
آمنت عظیم کہ حق برہماں نہاد

اب رہے مرزا کے بعض خطوط جن سے ان کے سنی ہونے پر استدلال کیا جاتا ہے وہ قابل لحاظ نہیں ہیں کیونکہ جن باتوں سے یہ استنباط کیا جاتا ہے وہ نہایت معمولی ہیں اور انہیں ان اشعار کے مقابلہ میں جن کو ایک خاص سنجیدہ کیفیت کے ماتحت اُس نے لکھا ہے پیش نہیں کیا جاسکتا۔ کیونکہ استمداد بالا دیار یا تراویح پڑھنا سنی ہونے کی قوی دلیل نہیں ہے جیسا کہ وصایت علی کا عقیدہ تشیع کا دلیل ہو سکتا ہے کہا جاتا ہے کہ غالب ہمہ دوست کے قابل تھے، صوفی مشرب رکھتے تھے اور صلح کل اُن کا مسلک تھا جیسا کہ اُن کے کلام اور خطوط سے بھی ظاہر ہوتا ہے اور اس عقیدہ کا آدمی شیعہ نہیں ہو سکتا۔ لیکن اگر میں اس کے تسلیم کرنے کے لئے مجبور کیا جاؤنگا تو پھر مجھے کنا پڑے گا کہ غالب نہ صرف شیعہ تھے، بلکہ اس سے بھی کچھ زائد علی اللہی تھے نصیری تھے اور وہ سمجھتے تھے کہ ذات علی میں خدا حلول کر گیا ہے جس طرح ہمہ دوست کی بحث نکال کر ان کو تشیع سے خارج کیا جاسکتا ہے اسی طرح اس استدلال پر علی اللہی بھی مانا جاسکتا ہے اور ایسا کہنے کے لئے ایک اور قوی وجہ یہ بھی موجود ہے کہ اُنھوں نے خود اپنے آپ کو اسد اللہی ظاہر کیا ہے۔

دیوان نوشاد

مجموعہ غزلیات ہے اور دہدھ کے مشہور تعلقہ دار جناب راجہ نوشاد علی خاں صاحب کا جس کو عالیجناب راجہ محمد اعجاز رسول خاں صاحب تعلقہ دار جہانگیر آباد نے اپنے نہایت دلچسپ مفید و پر لطف مقدمہ کیساتھ شائع کیا ہے۔ کتاب کا حجم، اس کی طباعت و ترتیب نہایت دلکش ہے اور مقدمہ اپنی معنوی خوبیوں کے لحاظ سے بالخصوص قابل ملاحظہ ہے۔ نوشاد لکنوی طرز کے خوشگوار شعراء میں ہیں ان کے کلام میں زبان کی صفائی، حسن ادا، محامدات اور محاکات کے دلچسپ نمونے موجود ہیں۔ اگرچہ بہت مختصر تنقید میں تفصیلی ریویو کا حق ادا نہیں کیا جاسکتا لیکن بعض اشعار قابل ذکر ہیں :-

اکہی کون یاد آیا ہے مجھ کو طبیعت آج قابو میں نہیں ہے

خدا جانے وہ کیا سمجھے ہیں دل میں دم آخر جو ہم سے بے خبر ہیں

میں جو مضطرب ہوا بلا سے ہوا تم تو خوش ہو گئے ستارے کے مجھے

سامنے سب کے تو ہم ضبط سلیقہ میں کام دل جو دکھتا ہے تو رو لیتے ہیں تنہائی میں

معلومات

جدید امریکہ | چکاگو (امریکہ) میں بچوں کے جہانی حالت کی تحقیق و نگرانی کا کام ایک مستقل محکمہ کی سپرد ہے امریکہ قوم کی آئندہ نسل اس طرح جدید اصولوں پر مرتب ہو رہی ہے چنانچہ اس محکمہ کا دعویٰ ہے کہ موجودہ امریکی لڑکے جن میں سولہ سے لیکر اٹھارہ سال کی عمر والے شامل ہیں اب اپنے آباؤ اجداد سے زیادہ قدر آور ہوتے ہیں اور کم از کم دو اچے اُن کا قد بڑھ گیا ہے۔

حسین ترین ملک | ملکہ رومانیہ یورپ کی حسین ترین شہزادی ہیں یعنی موجودہ بادشاہوں میں کوئی بھی ایسی خوبصورت ملکہ کا مالک نہیں

نیا گرہ آبشار | مشہور و معروف نیا گرہ آبشار کی غیر معمولی شہرت و عظمت بھی ایک دن ختم ہوتی نظر آتی اس لئے سٹرنز نیک ٹائیکلر ماہر طبقات الارض انڈیا کا خیال ہے کہ جھیل امیری کی سطح روز بروز بلند ہوتی جاتی ہے اور اگر انسانی مداخلت و تمدنی ضروریات قرب و جوار کے رقبہ میں کوئی تبدیلی نہ بھی کریں تو ایک ہزار چھ سو سال کی مدت میں یہ جھیل بھی جیل ہر دہ کی سطح پر آ جائیگی اور اس طرح دونوں جھیلوں کا پانی چکاگو پہنچا کرے گا اور آبشار نیا گرہ ہمیشہ کے لئے خشک ہو جائیگا۔

مچھلیوں کی تعداد | ایک چشمہ کا ۱۰x۱۵ فٹ رقبہ اور اس کے قرب و جوار کے بعض چھوٹے چھوٹے ٹکڑے ۱۰x۱۵ فٹ کے بھی تھے۔ اس موقع پر مچھلیوں کے شمار کا تجربہ کیا گیا لیکن پوری کامیابی نہ ہو سکی تقریباً ۷۵ فیصدی سے زائد مچھلیاں شمار نہ ہو سکیں جس کی وجہ یہ تھی کہ اکثر مچھلیاں دیر تک چھپی ہوئی بیٹھی رہتی تھیں۔ بہر حال اس تجربہ کا نتیجہ یہ ہے کہ ایک میل کے رقبہ میں ۶۵۴۴ مچھلیاں پائی گئیں۔ لیکن اگر اس میں بقیہ ۲۵ فیصدی کا بھی اضافہ کیا جائے تو یہ تعداد ۸۷۷۰ تک پہنچتی ہے۔

نیویارک لنڈن ٹیلیفون | آلہ خبر سانی کی تاریخ میں نئی دنیا اور یورپ کے درمیان سلسلہ ٹیلیفون کی تکمیل ایک عظیم الشان کارنامہ ہے۔ اس ٹیلیفون پر ۱۵۰۰۰۰۰ ڈیڑھ کروڑ روپیہ خرچ ہوا ہے۔ اور پہلے ہی دن جب سلسلہ گفتگو اور کاروبار شروع کیا گیا تو تخمیناً ایک کروڑ اسی لاکھ ۸۰۰۰۰۰ کا بیوپار ہوا

لیکن اس ٹیلیفون کا درمیانی فاصلہ اس سے بھی زیادہ حیرت انگیز ہے انگلستان میں اس کا پہلا بڑا اسٹیشن رکھی ہے جہاں سے انگلیتاں بھر کے سعات تقسیم ہوتے ہیں اور امریکہ میں ہولٹن مین ہے جہاں سے نیویارک اور دوسرے مقامات پر

پیغامات بھیجے جاتے ہیں اس وجہ سے تاروں یا شعاع برقی کا ایک حلقہ بن گیا ہے جس کا فاصلہ اگر ایک بولنے والے ٹیلیفون سے دوسرے پیغام رساں نوں تک لگایا جائے تو ۲۹,۰۰۰ + ۶۰۰ میل = ۲۹,۶۰۰ میل قرار پائے گا۔

اس ٹیلیفون کی دوسری عجیب خصوصیت یہ ہے کہ جب اس ٹیلیفون پر کام شروع ہوتا ہے تو لندن کے بازاروں کا نصف دن ختم ہو چکتا ہے اور جب ٹیلیفون بند کیا جاتا ہے تو امریکہ کا کاروبار کا نصف دن ختم ہو چکتا ہے۔ اس کے بعد ٹیلیفون اس لئے کام نہیں کر سکتا کہ پیغامات ایسے حالت میں صحیح نہیں پہنچ سکتے جب کہ ایک جانب تو دن ہو اور دوسرے حصہ میں جہاں کے پیغام بھیجا جاتا ہے رات ہو گئی ہو۔

بائیں ہاتھ سے کام کرنا عام طور سے لوگ سمجھتے ہیں بائیں ہاتھ سے کام کرنے والے بیوقوف اور کمزور ہوتے ہیں اور انسانی عیوب میں اس کا بھی شمار کیا جاتا ہے۔ لیکن حال میں ڈاکٹر ریز نے خصوصیت سے ایسے لوگوں کے دماغی تحقیق کی ہے جو اپنے بائیں ہاتھ سے کام کرنے کے عادی ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ دماغ کا نصف دماغ حصہ جب زیادہ قوی ہوتا ہے تو لوگ بائیں ہاتھ سے کام کرنے لگتے ہیں۔ ان کے نزدیک یہ دماغی کمزوری نہیں ہے اور مثال میں بائیں ہاتھ سے کام کرنے والی مصور مینزل کا نام پیش کیا جاتا ہے جس کے دماغ کی دہنتی جانب بہت زیادہ حساس اور قوی تھی۔

سینما کی کامیابی رڈولف ولینڈینو ایک اطالوی لڑکا تھا جس کی عمر مشکل سے اٹھارہ سال کی ہوگی وہ اپنے وطن سے نکل کر امریکہ پہنچا اور ہالی وڈ کے عجائب کہہ میں داخل ہو گیا جہاں محرک تصاویر کے (فلم) تیار ہوتے ہیں چند سال کے بعد دنیا نے سنا کہ ولینڈینو نہ صرف بہترین ایکٹروں میں شمار ہونے لگا ہے بلکہ اظہار معاشقہ کے لئے اس سے بہتر صاحب فن کوئی نہیں ہے۔ جن دجال کی دنیا اس پر شمار تھی، زرد جو اہر کے انبار اس پر قرباں تھے۔ جوانی اور شباب کی سرمستیاں گویا اسی کے لئے وضع ہوئی تھیں اور شہرت و قبول عام کی کوئی بلندی ایسی نہ تھی جو اس کے قدموں کے نیچے پا مال نہ نظر آتی ہو۔ امریکہ سے گزر کر یورپ و ایشیا کی کوئی سر زمین ایسی نہ تھی جہاں اس کے ہزاروں لاکھوں شہیدانی موجود نہ ہوں۔ مقبولیت دہر دلعزیزی کی یہی کیفیت تھی کہ دفعۃً رڈولف ولینڈینو کو ایک شدید بیماری پیش آئی اور اس کے لئے عمل جراحی تجویز ہوا یہ حادثہ امریکہ اور یورپ کے لئے غالباً دنیا کے اہم تاریخی واقعات سے بھی زیادہ سخت دہوناک تھا کہ بیمار پرسی کرنے والے اور ہمدردی کے پیغامات بھیجنے والوں کی تعداد کروڑوں سے متجاوز ہو گئی اور شفا خانہ کے محاذ میں کثیر تعداد میں ٹیلیفونوں کا اضافہ کیا گیا تاکہ جو بات میں تاخیر نہ ہو۔ متعدد ہوائی جہاز پیرس و امریکہ کے درمیان دوایں لانے اور ماہرین فن جراحی کی امداد حاصل کرنے کے لئے دورہ کر رہے تھے۔ عیادت کرنے والی اور سوگوار نازیلوں کی تعداد کا کیا شمار ہو سکتا ہے کہ اس کی موت کے بعد ہزار ہا رمال تو ان آنسوؤں سے تر پائے جاتے ہیں جن کی قیمت کا اندازہ کرنے

کے لئے دنیا کی بے تعداد دولت اور انسانی جذبات کے غیر معمولی فراوانی دونوں عاجز ہیں۔ ولینٹیو کے خبازہ کے ہمراہ لاکھوں انسانوں بھرے پایاں حرکت میں تھا اور خواتین کا پیہم غش کھا کھا کر گرتا باہمی جلوس میں وہ اہمیت پیدا کر رہا تھا جو دنیا کی بڑی سے بڑی ہستیوں میں بھی صرف بعض ہی کو نصیب ہوئی ہو۔

یہ تمام روداد جو اک مختصر مدت میں پیش آئی منحصر نتیجہ ہے اس مجنونانہ شیفنگی کا جو موجودہ زمانہ میں مغربی تہذیب و تمدن کے زیر سایہ فن ڈراما بلکہ اس کی مخصوص شاخ سینما سے پیدا ہو گئی ہے!

امریکہ میں ریڈیو کی ترقی | ۱۹۲۲ء میں صرف ۶ ہزار آلات ریڈیو ہان پائے جاتے تھے، لیکن ۱۹۲۶ء کے اخیر تک ان کی تعداد ساڑھے چھ ملین ہو گئی ہے اور روزانہ لاسکی اسٹیشنوں سے ۲۶ ملین پیغام روانہ ہوتے ہیں۔ اندازہ کیا گیا ہے کہ آلات ریڈیو کی قیمت جو صرف ۱۹۲۶ء میں خریدے گئے ۱۰۰ ملین گنی تک پہنچتی ہے اور ۱۹۲۲ء سے ۱۹۲۶ء تک ۳۰۰ ملین گنی ال پر ملک کا صرف ہو چکا ہے۔

امریکہ میں ۲۷ ملین خاندان ایسے ہیں جہاں گیارہ ملین فوٹو گراف ۱۸۱ ملین موٹر، ۱۷ ملین ٹیلی فون اور ۷ ملین ریڈیو استعمال ہوتے ہیں۔

بندروں کی تعلیم | اس وقت تک بندرون کو گفتگو کرنے کی تعلیم دینے میں کامیابی نہیں ہوئی، لیکن امریکہ کا ایک پروفیسر بیان کرتا ہے کہ چمپنزی بندر کو ابھرے ہوئے حروف پر انگلیاں استعمال کرنا اس طرح سکھایا جاتا ہے، جس طرح اندھوں کو، کیونکہ بندر میں نقل و تقلید کی اہلیت بہت زیادہ ہے۔ اگر پروفیسر مذکور اس میں کامیاب ہو گیا تو بندر کا کتابین پڑھ لینا بہ نسبت گفتگو کرنے کے زیادہ آسان ہو جائیگا۔

آنکھ اور سنا | مشہور ہے کہ سنا کی متحرک تصویر دن کے طرف دیکھنا نگاہ کے لئے مضرت رسان ہے۔ لیکن حال ہی میں ولایت کے دو ڈاکٹروں نے کامل تحقیقات کے بعد یہ رائے ظاہر کی ہے کہ رسائل و جرائد کا ۴۵ منٹ تک مطالعہ کرنا، سینما میں ڈیڑھ گھنٹہ تصاویر کا مطالعہ کرنے سے زیادہ مضرت رسان ہے۔

سب سے بڑا مینار | ہوائی جہانوں کی ہدایت کے لئے بڑے بڑے مینار طیارہ کرائے گئے ہیں جن میں رات کو نہایت تیز روشنی ہوتی ہے اور بہت دور سے ہوائی جہاز چلانے والے کو سمت وغیرہ کا پتہ چل جاتا ہے۔ چنانچہ اس سلسلہ میں سب سے بڑا مینار حکومت فرانس نے قائم کیا ہے جس میں ایک ہزار ملین بی کی روشنی ہوتی ہے اور ۳۰۰ میل کے فاصلہ سے روشنی نمودار ہو جاتی ہے

:- مطبوعہ نگار مشین پریس نظیر آباد لکھنؤ باہتمام دھنل بگرامی :-